بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خامہ در خامہ

علیم صبا نویدی کی غزلیات پر مضامین کا انتخاب

مرتبہ

ڈاکٹر محمد علی اثر

پرنٹرس

تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز۔ مونٹ روڈ۔ مدراس ۲

کتاب کا نام ______ خامہ در خامہ

موضوع ______ علیم صبا نویدی کی غزلیات کا جائزہ

تعداد ______ ۷۸۶

سنہ اشاعت ______ ۱۹۹۴ء

قیمت ______ Rs: 80 روپیے

طابع و ناشر ______ تملناڈو اردو پبلیکیشنز مدراس ۲

کتابت ______ حسینی و سید شمسی مدراسی

سرورق ______ قیصر سرمست، حیدرآباد

مولف ______ ڈاکٹر محمد علی اثر

کاشانۂ اثر 9/226-4-20 چوک
حیدرآباد 500 002

ملنے کا پتہ

۱۔ علیم صبا نویدی ______ 26 امیر النساء بیگم اسٹریٹ، مدراس 600002

۲۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ ______ دہلی، بمبئی، علیگڈھ

۳۔ اسٹار پبلیکیشنز ______ آصف علی روڈ، دہلی ۲

۴۔ مکتبۂ شب خون ______ 313 رانی منڈی الہ آباد (یوپی)

۵۔ اسٹوڈنٹس بک ہاؤز ______ چار مینار، حیدرآباد

۶۔ مکتبۂ کہسار، ______ براہ پورہ، بھاگلپور (بہار)

فہرست

مقدمہ

○ ڈاکٹر محمد علی اثر

علیم صبا نویدی کی ہشت پہلو شخصیت اردو کے علمی اور ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی نقاد بھی ہیں اور تذکرہ نگار بھی۔ انہوں نے تحقیقی مضامین بھی تحریر کئے ہیں اور انشایئے بھی۔ اس کے علاوہ متعدد کتابوں کے مرتب اور مدون کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ علیم صبا صاحب اپنی شخصیت کی اِسی ہمہ جہتی، رنگارنگی اور متنوع صفات کی بنا پر اردو کے معاصر ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

علیم صبا نویدی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کے بھنور" ۱۹۶۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد انہوں نے اِسی صنف ادب میں دو اور مجموعے "شگاف در شگاف" (۱۹۸۰ء) اور "اُجلی مسکراہٹ" (۱۹۹۲ء) پیش کئے۔ ان کے ابتدائی افسانے روایتی انداز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد انہوں نے روایت پرستی سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور جدید رنگ کے افسانے لکھنے لگے۔ "روشنی کے بھنور" سے "اُجلی مسکراہٹ" تک کا سفر ان کی افسانہ نگاری کے تدریجی نشو و نما اور ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے۔ اشارہ و ایما اور اعجاز و اختصار ان کی افسانہ نگاری کا نمایاں وصف ہے۔ صبا نویدی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "جنوب کا شعر و ادب" بھی مرتب ہو چکا ہے۔ جو بہت جلد زیور طباعت سے آراستہ

ہونے والاہے۔ ترتیب و تدوین سے متعلق ان کی دو کتابیں "قید شکن" (آزاد غزلوں کا انتخاب) اور "آزاد غزل شناخت کی حدوں میں" بالترتیب ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں شایع ہوی ہیں۔ انہوں نے تمل ناڈو کے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ "تذکرۂ شعرائے تمل ناڈو" کے عنوان سے مرتب کیا ہے جسے ترقی اردو بیورو شائع کررہا ہے۔ یہاں علیم صبا نویدی کے فن اور شخصیت کے موضوع پر مشاہیر اردو کی مرتبہ کتابوں کا تذکرہ بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے صبا نویدی کی شہرت جنوبی ہند کی حدوں کو عبور کر کے پوری اردو دنیا میں پھیل گئی۔ اس قبیل کی کتابوں میں پروفیسر نجم الہدیٰ کی "علیم صبا نویدی آسمانِ فن کا سفیر" (۱۹۸۵ء) کاظم نائطی کی "لہجہ تراش" (۱۹۸۴ء) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی نقش بند اور اور "نقش قلم" (۱۹۹۲ء) اور ڈاکٹر اختر بستوی کی "روشن لکیر" (۱۹۸۹ء) قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ علیم صبا صاحب نے اپنے ادبی سفر کی ابتداء افسانہ نگاری سے کی تھی اور انہوں نے تحقیق و تنقید اور ترتیب و تدوین کا کام بھی انجام دیا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی ناموری اور مقبولیت کا دار و مدار صرف شاعری پر ہے۔ ان کی گراں مایہ شعری تخلیقات کے مقابلے میں نثری کارنامے وقیع ہونے کے باوجود نمایاں نہیں ہیں۔

علیم صبا نویدی کے اب تک ایک درجن سے زاید شعری مجموعے شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ جن میں چار مجموعے "طرحِ نو" (۱۹۷۵ء) "فکر بر" (۱۹۸۱ء) "نقش گیر" (۱۹۸۴ء) اور "اثر خامہ" (۱۹۹۲ء) جدید غزلوں پر مشتمل ہیں۔ تین مجموعے "مراۃ النور" (۱۹۸۸ء) "نور السمٰوات" (۱۹۹۰ء) اور "نٓ" (۱۹۹۰ء) نعتیہ شاعری کے مجموعے ہیں۔ "لمسِ اول" (۱۹۷۸ء) "بھارت جوتی" (۱۹۸۵ء) ان کے دیگر مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ جن میں اوّل الذکر ٹیپ بند نظموں کا مجموعہ ہے جبکہ آخر الذکر قومی نظموں پر مشتمل ہے حال ہی میں علیم صبا کی منظومات کا ایک اور مجموعہ "سمت ساز" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔

علیم صبا نویدی کی طبع رسا نے شاعری کے میدان میں جو اپنی جولانی دکھائی ہے

اور نئے نئے تجربے کئے ہیں وہ ایک علاحدہ باب کی حیثیت رکھتے ہیں اردو میں آزاد غزل، کے اولین نمونے "مظہر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی کے کلام میں نظر آتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں صبا صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس صنف شاعری پر انھوں نے اس کے دور طفولیت ہی میں باقاعدہ توجہ کی اور نہ صرف یہ کہ آزاد غزلوں کا پہلا مجموعہ "ردِ کفر" کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا بلکہ آزاد غزل کا پہلا انتخاب "قید شکن" (۱۹۸۲ء) بھی شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

علیم صبا ایک تخلیقی فنکار ہیں انھوں نے جہاں جدید اصنافِ شعر" ہائیکو، سانیٹ" بلانک ورس وغیرہ میں اپنی جدتِ فکر اور طبع رواں کے جوہر دکھائے ہیں وہیں سانیٹ" کی ہیئت (FORM) میں نعتیں کہہ کر" نورالسمٰوات "کے عنوان سے نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ مرتب کیا ہے نعت گوئی کے میدان میں علیم صبا صاحب کو کمال حاصل ہے۔ بقول پروفیسر عتیق احمد صدیقی" ان (علیم صبا نویدی) کے لہجے کے حسن نئے پن کا اردو دنیا میں اعتراف کیا جاتا ہے اسکی آمیزش سے نعت کو بھی ایک نیا رنگ و آہنگ ملا ہے۔ "صنف نعت رسولؐ" میں علیم صبا نویدی صاحب کو تین مجموعے شایع کرنے کا شرف بھی حاصل ہے"!

علیم صبا نویدی کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ نے انھیں "امتیاز میر" ایوارڈ کیلئے منتخب کیا ہے یہ انعام سرزمین تملناڈو سے پہلی بار کسی شاعر یا ادیب کو دیا جارہا ہے۔

صبا صاحب جدید اردو شعراء کے زمرے میں مشاعروں کے راستے سے نہیں بلکہ رسائل وجرائد اور کتابوں کے توسط سے داخل ہوئے۔ ان کی شہرت تیزی سے پھیلی اور اس کے پھیلنے میں انکے منفرد لب و لہجہ اور مخصوص طرز احساس کو بڑا دخل ہے۔ ان کی شاعری وقتی طور پر محظوظ کرنے والی چیز نہیں بلکہ قارئین اور سامعین پر اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ علیم صبا کی تخلیقات کا سرچشمہ ان کے کتابی مطالعہ سے زیادہ انکا

ذاتی مشاہدہ اور ان کی حساس طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اسالیب، علامات اور لفظیات پر غور کیا ہے اور انھیں اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

علیم صبا نویدی ایک جدید اور جدّت پسند شاعر ضرور ہیں ان کے کلام کے مُطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ انھوں نے اُردو شاعری کی روایت سے انحراف یا چشم پوشی بھی نہیں کی۔ اردو غزل کی روایت اور اسکے نشیب و فراز سے وہ بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کا ذوق و ذہن ہمارے شعری ورثہ اور تہذیبی روایت سے پوری طرح سیراب ہے۔ روایت کی پاسداری کے باوجود وہ روایتی شاعری کے غُبار میں گم نہیں ہوئے بلکہ عصری زندگی کو اپنے عہد کے تازہ محاورہ میں کہنے کی کوشش کی۔

ے گھر کے باہر قبرستان
گھر کے اندر تنہائی
گونجتی رہ گئی صدا میری
لفظ نکلے نہ تھے مرے لب سے
سانسوں میں آگ، لب پہ دُھواں، رُخ پہ دُھند ہے
تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی
ہر ایک سوچ کی کھڑکی سے پھوٹتی ہے کرن
نہ جانے کونسا مینار ہے مرے اندر
میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر
میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اُتار
روز بن برسے گذر جائیں گے بادل کب تک
اپنے اشکوں سے صبا ان کو بھگوتا اک دن
کہیں ظاہر میں وہ نہیں موجود
پھر یہ باطن میں شان کس کی ہے

تمہاری یاد کے شعلوں کی آبرو کے لئے
سلگ کے بجھ گئے ایسے دھواں ہوئے ہم لوگ
زمانہ پوچھ رہا تھا زمیں بھی ششدر تھی
ورق ورق پہ نمایاں یہ نام کس کا تھا

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علیم صبا نویدی لفظوں کے مزاج شناس ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور معنی خیز تراکیب کے استعمال سے اپنے کلام میں ایک طرف عصری حسیّت کو سمو دیتے ہیں تو دوسری طرف تہہ داری یا مفاہیم کی ایک سے زاید سطحیں پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں علیم صبا کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انکی تخلیقات کہنہ اور فرسودہ حصاروں اور تقلیدی قطاروں کو توڑ کر اپنا اظہار کرتی ہیں ان کا یہی رویہ جدید غزل گو شعرا میں اہمیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو زندہ شاعری کا حصّہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

علیم صبا نویدی کے رنگ تغزل کو دور حاضر کے متعدد نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں سراہا ہے ذیل میں برصغیر ہندو پاک کے چند ممتاز نقادوں کے تاثرات درج کئے جاتے ہیں۔

● ـــــــ فراق گورکھپوری

"علیم صبا نویدی کی غزلوں میں جو نیا لہجہ ہے وہ بڑا کشش انگیز ہے"

● ـــــــ آل احمد سرور

"علیم صبا نویدی نے صرف اس دور کے معروف اور مقبول موضوعات کی عکاسی ہی نہیں کی ہے بلکہ ذاتی نظر اور ذاتی تجربے کو بھی شعری جامہ پہنایا ہے صبا نویدی کی غزلوں کی سچی آواز اور شگفتہ اسلوب نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے"

● ـــــــ شمس الرحمٰن فاروقی

علیم صبا نویدی شاعری کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں اور نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ ان کے ہاں

تخیل کی بھی فراوانی ہے"

● ________ ڈاکٹر حامدی کاشمیری

علیم صبا نویدی پوری آگہی اور دردمندی سے شخصی سطح پر محسوس کئے گئے تجربات کو پیکر اور علامت میں اسیر کرتے ہیں۔ ان کی تاثرپذیری میں خلوص اور شدت ہے وہ لفظوں کی طلسمی کیفیت کو بیدار کرکے قاری کو لاشعوری دنیاؤں میں سفر کراتے ہیں جہاں وہ قدم قدم پر تلاش و دریافت کے عمل سے گذرتا ہے"۔

● ________ ڈاکٹر وارث علوی

"علیم صبا نویدی کی غزلوں میں نیا احساس، نیا رنگ اور نیا اسلوب سبھی کچھ ہے"

● ________ ڈاکٹر سلیم اختر

" مجھے علیم کے اشعار میں معانی کی دوہری سطح نظر آتی ہے۔ ایک سطح پر یہ علیم صبا کی اپنی واردات ہیں تو دوسری اور گہری سطح پر ان کے ذریعہ علیم نے اپنے عصر سے اپنا رابطہ استوار کیا ہے"۔

● ________ ڈاکٹر محمد حسن

نئی شاعری سماجی شعور سے دور رہ کر یا اسے رد کرکے بہت آگے نہیں جاسکتی اس شعور اور احساس سے پیدا ہونے والے تجربے کو نیا لہجہ اور نئے طریق اظہار میں ڈھال سکتی ہے اور یہ رمز نویدی نے پالیا ہے۔ اس لحاظ سے نویدی کی غزلیں آتش رفتہ کے سراغ سے خالی ہیں اور نہ نئے دور کی بجلیوں سے"۔

● ________ ڈاکٹر وزیر آغا

علیم صبا نویدی کی غزل میں دروں بینی کا رجحان خاصا توانا ہے۔ وہ کائناتِ دل کا بار بار ذکر کرتے ہیں کبھی اسے اندر کا دیار قرار دیتے ہیں کبھی اسے آسمان کا عکس گردانتے ہیں اور کبھی اسے سمندر اور پھر سیپ سے تشبیہہ دیتے ہیں انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ گوہر ان کے بطون میں کہیں موجود ہے اور وہ ایک دن نہ صرف خود اس سے پوری طرح

آشنا ہو سکیں گے بلکہ اس کی چمک دل کے نہاں خانے سے نکل کر پورے عالم میں پھیل سکے گی

● ——— ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

اُردو شاعری کی روایات اور کلاسکس سے جن نئے شاعروں نے اپنے رشتے کو استوار اور مضبوط رکھا ہے علیم صبا نویدی ان میں سے ایک ہیں۔"

● ——— ڈاکٹر انور سدید

علیم صبا نویدی نے اپنے مشاہدات، زمانے کی تلخیوں سے سمیٹے ہیں انھوں نے زندگی پر محبت کی نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مبہم کرب ان کی غزل پر چھایا ہوا ہے"۔

ناقدانِ ادب کے ان تاثرات کے مطالعہ کے بعد ادب کا کوئی بھی باذوق قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ علیم صبا نویدی ایک فطری شاعر ہیں انھوں نے اپنے طرزِ اظہار اور طرزِ فکر کی بنا پر جدید اُردو غزل کے معتبر شاعروں میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے ان کی فکر پامال راستوں سے گذرنے کے بجائے ابتدا ہی سے نئی نئی جہتوں کی تلاش میں رہی ہے۔ ان کا اسلوب۔ طرزِ احساس اور تجربوں کی جانب ان کا رویّہ کسی دوسرے شاعر سے میل نہیں کھاتا۔

"خامہ در خامہ" علیم صبا نویدی کے تازہ مجموعہ کلام "اثر خامہ" پر اُردو کے معتبر اہلِ قلم کے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں بارہ مضامین شامل ہیں جن سے علیم صبا نویدی کے فکر و فن کی مختلف اور متنوع جہات سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر ساحل احمد نے اپنے مضمون "تونگری فکر کی مثال" کے ذریعے علیم صبا کی غزلوں میں پائی جانے والی منفرد لفظیات اور ان کی وضع کردہ تراکیب اور امیجری کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے فکر و فن کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ڈاکٹر علی احمد جلیلی علیم صبا کو نئی غزل کا ذہین، حساس اور باشعور فنکار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے غزل کو نہ صرف نیا وقار اور نیا لہجہ عطا کیا ہے بلکہ کلاسیکی غزل کی مستحکم

روایات کے تسلسل کو جدید غزل سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔
مولانا راہی فدائی نے اپنے مضمون "اثر خامۂ علیم صبا نویدی" میں ندرت ترکیب کی اصطلاح کی جدید شاعری کے سیاق و سباق میں تشریح و توضیح کرتے ہوئے علیم صبا کی غزلوں کے اشعار کے تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ، ان کے ہاں پائی جانے والی ندرتِ ترکیب اور ندرتِ فکر کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ سلیم انصاری صاحب علیم صبا کو جدید غزل کی صحت مند روایات کا امین کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا دھیما دھیما سلگتا ہوا لہجہ ہے جس کی تہہ میں غم و غصّہ۔ عیش و نشاط۔ بغاوت و نفرت اور احتجاج کی لہریں موجزن ہوتی ہیں ڈاکٹر مقبول فاروقی نے علیم صبا کو جدید اردو شاعری کا مجاہد قرار دیتے ہوئے اپنے مضمون میں نویدکے کلام کے فکری اور فنی ارتقا کو مثالوں کے ذریعہ موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اشرف فیض اکبرآبادی نے اپنے مضمون میں جدید اردو شاعروں کے گروہ میں علیم صبا کی اہمیت اور مقام کے تعین کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار علیم صبا کو غزل کی جدید لفظیات کا معمار کہتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ انھیں لفظوں کے برتنے میں کمال حاصل ہے۔ سادہ رواں اور دل کو چھو لینے والے الفاظ کے ذریعے انھوں نے غزل کا ایک نگار خانہ بنا رکھا ہے۔ صبا نویدی لفظوں کے حسین امتزاج سے خیال کے ایسے پیکر تراشتے ہیں کہ نگاہوں کے سامنے مناظر کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر غیاث اقبال مرحوم نے اپنے مضمون "ناقدینِ علیم صبا" میں صبا صاحب کو ایک فعال اور متحرک تخلیق کار قرار دیتے ہوئے ان کے فن کے بارے میں مختلف نقادوں۔ پروفیسر نجم الہدیٰ۔ ڈاکٹر عبدالمغنی۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی، پرتپال سنگھ بیتاب، پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر ظفر ہاشمی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے عبدالمتین جامی نے اپنے مضمون میں علیم صبا کے کلام پر پائی جانے والی فارسیت کی چھاپ کی نشاندہی کی ہے اور فارسی کی آمیزش کو ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی صبا کے دلکش پیرایۂ اظہار

اور تاثر کلام کے رطب اللسان ہیں جب کہ ڈاکٹر رفعت اختر نویدی کی جدید تراکیب اور بندش الفاظ کے ثنا خواں ہیں۔ ڈاکٹر سجاد حسین نے صبا نویدی کی نعتیہ شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے اپنے مضمون میں صبا نویدی کے لہجے کی انفرادیت اور ان کے کلام میں پائے جانے والے سماجی اور تہذیبی عناصر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں، میں اس کتاب کے مرتب کی حیثیت سے تمام مضمون نگار حضرات سے فرداً فرداً اظہار ممنونیت کرتا ہوں جنھوں نے علیم صبا نویدی کے رنگ تغزل اور انکے فکر وفن کے مختلف گوشوں کو اپنے مخصوص انداز میں روشن کیا ہے۔ مولانا راہی فدائی بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا۔ ——

محمد علی اثر

۱۵ر مئی ۱۹۹۴ء حیدرآباد

اثر خامہ
تونگریٔ فکر کی مثال

ڈاکٹر ساحل احمد، الٰہ آباد (یوپی)

سائنسی علوم اور تہذیبی رویے نے غزل کی نازکی اور طرح داری کو جس نئی صحبت سے آشنا کیا وہ جہت تونگری کا باعث بنی۔ غزلیہ فکر میں ایجازی اور ایمائی زاویے اجاگر ہوئے جس نے غزل کے عشقیہ دائرے کو وسیع المعنی کیا اور اسے اس لائق بنایا کہ کائنات اور مسائل کائنات سے چشم پوشی نہ کرسکے۔ علیم صبا نویدی نے اپنی غزلوں میں دروں بینی کے اس رجحان کو سمونے اور بروے کار لانے کے لئے فکر و معنی کے رشتے پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ تاکہ "وقت" اور اس سے جڑی تمام حقیقتیں غزل کا حصّہ بن جائیں۔ انہوں نے لطیف انسانی جذبات اور نازک احساسات کی مصوری کرتے ہوئے اُن کے خدوخال کو حیات و کائنات کی منشاء و حقیقت کے مطابق رنگنے کی سعی کی ہے۔ علیم صبا نویدی نے خارجی اشیاء کی تہذیب و تحسین کرنے میں جس شعری رویہ کو ملحوظ رکھا ہے وہ واردات و تجربات کی گہری سے گہری تہوں کو جگانے، نموگیر کرنے اور برانگیختہ کرنے کی ضرورت رکھتی ہے۔ فکر و تہذیب اور نفس و باطن کی سوئی حقیقتوں کے جاگنے یا نمو پانے کا موقعہ ملتا ہے اور مقتضائے وقت کی بے نقابی، کائنات کی بے نقابی کا موجب بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں بالیدہ ذہنی کی وافر مثالیں موجود ہیں۔

• ایک عالم میں رہا میرا وجود
سات عالم میں رہا میرا سفر

• آنکھ میں نقش ہائے منظر سبز
در و دیوار میں چھپا کیا ہے

• ظاہراً روشن تھے سب کے سب یہاں
اپنے باطن میں منوّر کون تھا

• ذات میری ہے سراپا ضوفشاں
نور باہر نور اندر نقش گر

• کہیں ظاہر میں وہ نہیں موجود
پھر یہ باطن میں شان کس کی ہے

• لہولہو ہوا جب سے یہ آسمانی سفر
نظر میں رشتۂ فکر سراغ جاگا ہے

• زمانہ پوچھ رہا تھا، زمین بھی ششدر تھی
ورق ورق پہ نمایاں یہ نام کس کا تھا

• میری طرف اندھیرے اچھالے گئے بہت
جب میری اپنی ذات اجالوں میں آ گئی

• مجھ سے ولی صفت کی کہاں قدر و منزلت
معبد سے دور ہی مرا سجدہ جواں ہوا

ان کی غزلوں کا یہ پر تفوق رنگ کلام کی معنوی سطح کو اور بھی زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ یہ رنگ اُن کے ذاتی تجربہ سے کشید کیا ہوا رنگ ہے۔ جس سے شاعر کی شخصیت ہی نہیں اس کی سوچ و فکر بھی آنکی جا سکتی ہے۔ یہی نہیں یہ رنگ رمز و ایما کی تخلیق میں بھی معاون ہو سکتا ہے۔ نویدی کی سوچ جس آزادی اور بے باکی کا مطالبہ کرتی ہے اس کی برقی تپش غزلیہ شعروں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے ان شعروں میں ذاتی شخصیت سے ابھرنے والے تاثر اور تجربے کی احتسابی کیفیت ملتی ہے۔

اسی طرح انہوں نے لفظوں کے استعمال میں موقع و محل کا خاص خیال رکھا ہے۔ تہذیبی ثقافتی اور دعائیہ رشتوں میں گہرا ربط اور گہرا شعور پیدا کرنے کے ہنر سے بہ خوبی آشنا ہیں۔ انہوں نے خدا پرستی اور علم و اخلاق کی تو نگری پر جس خامہ گری کا نقش منور کیا ہے۔ وہ قاری کو اپنی تلاش کی طرف ہی راغب نہیں کرتی بلکہ اُسے بے چین بھی رکھتی ہے۔ تلاش و تجسّس کی اس آگ کو محلی رکھنے کی سعی کی گئی ہے کیونکہ زندگی کی پائیداری اور خوشیوں کے لئے اچھی دنیا کی تعمیر کے لئے۔ ذہنی و فکری طہارت کے لیے اسی آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آگ انہیں لفظوں کے بطن سے پیدا ہوتی ہے جن کا استعمال تخلیقی سطح پر کیا گیا ہو۔ لفظ کی معنوی جوت کو جگائے رکھنے کے لئے مرکبات اور نئی ترکیبیں وضع کیں۔ ذائقہ، سات عالم، دیدۂ تر، بخیل بسنت رُت، سج دھج، زلفوں کا ناج، تاریک چاہتوں کی غذا، بے رس تبسّموں کی گھٹا، سبز رتوں کا پاگل موسم، ظاہر و باطن کا گہوارہ، سنگسار، فریب خوردہ لہو کا عذاب، پیراہن سفید زرخیز زمین۔ نحیف سانس، نئے شکوک، کالا ناگ، گنگناتی رُتیں، اکیلاپن، سیہ پوش بہار، بے رنگ دعا، درد کا نادیدہ سرمایہ، غم کی چلچلاتی دھوپ، ملاقات کا کچّا احساس، دیرینہ روش، نت نئے رنگوں کی لذّت، اونگھتے چوتھے، کاغذی خانہ، چپ کی بنیاد، ادراک، سپاہی، سہاگن، سچائی کی سولی، جراثیم، سوکھی ندی، تابوت، فسردہ سانس سبز لمحوں کا سپاہی، اذیت ناک سانس، سیندور ظاہر داری، روشنی کے پاؤں، نبض پرسی مجلسی چہروں کا انبساط، اخلاق کے ننگے کرشمے، درونِ خانہ خراب وغیرہ ایسی ہی مثالیں ہیں عموماً یہ الفاظ و تراکیب نئے، انوکھے اور دلچسپ ہیں جنہیں پہلی بار نویدی نے اپنی غزل تراشی کے لئے استعمال کیے ہیں۔ ان کے اسلوب کا یہ ذائقہ نیا اور بہت زیادہ نیا ہے۔

کلمہ نفی کے لیے "لا" کا استعمال تلاش ذات کا ہی مظہر ہے۔ اسی طرح نیلا، سیہ، پیلا، سبز، زرد، سفید، رنگ ہی باطنی اظہار کا وسیلہ ہیں۔

• ترا وجود تو رنگوں کا اک سمندر تھا • آنکھ میں نقش ہائے منظر سبز

• آخری وقت کی سزا کیا ہے • نوری دنیا، نوری چہرے

• آئینۂ حیات کا جوہر بھی جل گیا • کل تلک ذات مقید تھی، زمیں تک محدود

• جسم و جاں کا عذاب غرق ہوا • لامکاں میں بامکاں اپنا نصیب

• پیراہنِ سفید میں روپوش ہو گیا • لاسمتیت کے نور کا چکھنا ہے ذائقہ

• لے گیا تھا درد کا نادیدہ سراپا وہاں • جو قطرہ تھا دریا ہوا، دریا سے سمندر

• آئینہ در آئینہ گھر اور تھا • ہے انوکھا مری تخلیق کا رنگ

"ہے انوکھا مری تخلیق کا رنگ" نویدی کی غزل پر صادق آتا ہے۔ اُن کا یہ کنتا خام خیالی نہیں۔ بلکہ صداقتِ احساس کا منظر نامہ ہے۔ اس منظر کو موضوعی تفکر نے مزید جلا بخشی ہے"۔ "عصر" سے چشم پوشی نہیں کی اور نہ اذیتوں کا سفر کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان کی غزل اقرار سے بھی آگے کی وہ منزل ہے۔ جہاں سے خود احتسابی کا احساس جلا پانے لگتا ہے۔ اور لفظ و معنی کے رشتے سے معنی کے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔

خامشی عافیت ذات ہے خاموش رہو
ورنہ ماحول میں، پھر زہرِ گماں پھیلے گا۔

پگھل کے درد نے پائی ہے کائنات نئی
کہ سنگ سنگ یہاں بولتا سا لگتا ہے

میں خموش سا برسوں ذات کی صدف میں تھا
وقت مجھ کو جلوؤں کی صورتوں میں لے آیا

میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر
میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اتار

ہمارے زخم ہیں انمول کیا خریدو گے
اگرچہ شہر میں سب کا لہو ہوا سستا

غزل اور علیم صبا نویدی

○ ڈاکٹر علی احمد جلیلی، حیدر آباد

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس نے ہر دور انتشار میں اپنی آبرو کا تحفظ کیا اور کئی قتل گاہوں سے گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔ پرانی نسل اپنا کام کر چکی۔ اب نئی نسل اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری میں مصروف ہے۔ روایتی غزل کا جب طلسم ٹوٹا اور غزل کی دنیا میں نئی ہوا آئی تو اس نے بہت سے فنکاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ردعمل مثبت بھی ہوا اور منفی بھی۔ بہت سے شاعروں نے غزل کے کلاسیکی مزاج کو رد کر کے "نئے پن" کے جنون میں بیک جست تمام فاصلے طے کر لینے کی کوشش کی اور اپنا توازن کھو بیٹھے لیکن اس ہجوم میں نئی نسل کی ایک کھیپ ایسی بھی ابھر کر سامنے آئی جو ذہین، حساس باشعور، تازہ دم اور حوصلہ مند تھی۔ اس نے نہ صرف غزل کو نیا وقار دیا بلکہ غزل کی مستحکم روایات کے تسلسل میں نئی روایت ڈھالی۔ علیم صبا نویدی اسی زمرہ کے شاعر ہیں۔

صبا نویدی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نئی غزل کے راستے پر گامزن ہوئے اور اس سفر کو اپنی پہچان کا سفر بنایا اپنی شخصیت کا نقش قائم کیا۔ ان کی کوشش یہی رہی کہ ہجوم کا حصہ بننے کے بجائے ان کا لکھا ہوا ان کے نام سے پہچانا جائے۔ چنانچہ پہلے تو نئے تجربوں سے اپنا ذہنی رشتہ استوار کیا اور پھر تجربوں کو اپنے ذاتی تخلیقی عمل سے گزار کر اپنے ڈھب میں شعری صورتگری کی۔ اب تجربے کی اس صورتگری

میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے ہمیں آگہی کی نئی صورتیں اور اظہار کے نئے قرینے سامنے آرہے ہیں۔ ان کی غزلوں سے چھن کر آنے والی یہ روشنی نئے شعور و احساس سے عبارت ہے جس پر صبا نویدی کی اپنی چھاپ ہے جو فن غزل کو ایک نرالی جہت دیتی ہے۔ اس طرح اپنا ایک علیحدہ امیج قائم کر کے انہوں نے پچھلے ادوار میں رائج ہونے والے کلیشیوں سے نجات حاصل کر لی ہے۔ غزل کو بالعموم خطِ مستقیم سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ غالب کے عہد میں یہ لکیریں ٹوٹی ہیں۔ علیم صبا نویدی نے ان لکیروں کو پھلانگنے کی جرأت کی اور اپنی راہ الگ متعین کی ہے۔

غزل کا فن عمرانی تجربے کا فن ہے۔ اردو غزل کو ہر دور میں فکری عوامل کے ساتھ سماجی عناصر کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ علیم صاحب کی غزل کا پس منظر بھی آج کا انسان ہے۔ اس کا اپنا معاشرہ ہے چنانچہ وہ مشینی معاشرہ سے پیدا ہونے والی لا یعنیت پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ محرومی، مایوسی، تنہائی، شکستگی بیزاری اور بے بسی آج کے انسان کا مقدر ہیں۔ یہ مشاہدات انہوں نے زمانے کی تلخیوں سے سمیٹے ہیں اور انسان کا کرب اپنی ذات میں محسوس کیا ہے۔ جب یہ احساس شدت اختیار کرتا ہے تو داخلی کرب و اضطراب زخموں کی شاعری میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہی زخم شاعر کے روحانی ارتقائے شعر میں چراغ راہ بنتے ہیں اور اس بے کیفی و بے یقینی کو روشنی میں لاتے ہیں جن میں آج کا انسان مبتلا ہے۔ اس طرح صبا نویدی بکھرتے ٹوٹتے سماج کا ایک بھرپور تاثر قاری کو منتقل کرتے ہیں۔ ان کے کردار زمانے کے سرد و گرم سے پوری طرح گزرتے ہیں جس کے ساتھ ان کی دردمندی کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔

ہر دور میں غزل کی معنوی اور داخلی تنوع میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس کو اظہار کے سانچوں میں ڈھلنے کے لئے اسی دور نے شعوری اور لاشعوری طور پر غزل کو نئی لفظیات فراہم کی ہیں اور اسلوب کو بھی بڑی حد تک بدل ڈالا ہے۔ علیم صاحب کی فکر و نظر میں نئی غزل کا مابہ الامتیاز، زبان کے تخلیقی زاویے ہیں کیونکہ بہت سے

ارتسامات وکیفیات کا اظہار عقلی منطقی طریقوں اور الفاظ سے ممکن نہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر انہوں نے غزل میں لفظ کے نئے تلازمے سے اور خیال کو نئے قرینے سے پیش کیا ہے۔ لغوی لفظ چونکہ برہنہ ہوتا ہے اس لئے اس کا استعاراتی ادراک و استعمال ہی اس کے معانی کی مختلف کیفیتیں اور اس میں گتھے ہوئے جذبات کو بیان کرنے کی توانائی عطا کرتا ہے۔ اس عمل میں کبھی لفظ خود استعارہ ہوتا ہے اور کبھی چند بنیادی الفاظ اپنی معنویت کے اظہار کیلئے دوسرے الفاظ کی قلبِ ماہیت کرتے ہیں۔

الفاظ کا یہ جادو صبا نویدی کے یہاں مختلف سطحوں پر جگایا گیا ہے۔ لفظیات کو تلازموں کے ذریعہ مربوط کرکے صفات اور نئے اسمائے صفات کے استعمال کی صورت میں اور ایسے مرکبات کی تشکیل میں بھی جو ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ متناقض ہوتے ہوئے بھی تلازمی رشتوں کو برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً اوراق کی ہتھیلی، آنکھ کا کمرہ جسم کا سورج، خوشبو کا لہو، شعور کا دربار، احساس کی سڑک، آدمیت کی لویں، پیاسی لکیر، افق کی سیڑھیاں، خلاؤں کے دریچے۔ نیلی تمنا، میلی خوشبو، خوابوں کا داغ، پلکوں کی دہلیز، کچا احساس، کاغذی شہر، سبز لمحے، چیختے رنگ، روشنی کے پاؤں، نوری چاہتیں، نظر دار، ملن ساز، میلے ارمان اور کالی خواہش وغیرہ۔ یہ استعارے، علامتیں اور تلازمے ان کی غزلیہ شاعری کا حوالہ بن گئے ہیں۔ ان کا فنکارانہ استعمال معنی کی اکہری سطح کو ابھارتا ہے۔ اس طرفہ کاری سے علیم صاحب کی غزلیں لفظ و معنی میں انوکھا ارتباط پیدا کرتی ہیں۔

کچھ شاعروں اور ناقدوں کی نظر میں جدید غزل کا ایک وصف اس کا کھردرا پن بھی ہے لیکن اس سے سبھی متفق نہیں اسے نئی غزل کا لازمی عنصر قرار نہیں دیا جاسکتا میں سمجھتا ہوں یہ ایک بڑی زیادتی ہے جو غزل کے ساتھ کی جارہی ہے۔ صبا نویدی کیلئے بھی یہ رجحان لائق غور ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ نویدی صاحب

نے 'حدیث دلبری' سے اپنی غزل کو بڑی حد تک دور رکھا ہے۔ جمال پرستی کا رجحان بہت کم ملتا ہے۔ یہ وہی موضوع ہے جس پر غزل کی خشت اوّل رکھی گئی اور یہ وہ جذبہ ہے جس سے ہر انسان آشنا ہوتا ہے۔ صبا نویدی بھی اس سے نا آشنا نہیں لیکن انہوں نے تبسم کے پھول چُننے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ ان رنگوں کو نہیں پکڑا جو قدم قدم پر دعوت جلوہ دیتے ہیں، ایسے پیکر نہیں تراشے جن کے بدنوں سے نکلتی ہوئی مہک قاری کو گرد و پیش کے پرشور ماحول سے نکال کر کچھ دیر کیلئے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ نئی غزل کے بہت سے علمبرداروں نے بھی اس عنصر سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کی کسک بھی شامل رکھی ہے۔

علیم صبا نویدی کی غزلیہ شاعری اور ان کی شخصیت کئی حیثیتوں سے ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ وہ حد درجہ فعال ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات کا سفر جاری ہے۔ نئی غزل کو انہوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ وہ ارتقا کے تخلیق کار ہیں۔ ان کی نئی طرز احساس کی غزلیں ان کی انفرادیت کا تشخص ہیں۔ ان کا قابل ذکر وصف ادبی و شعری میلانات سے ان کے انحراف کی جرأت ہے۔ یہ جرأت جرأتِ رندانہ ہی سہی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے لہجہ کی کھنک اور ان کی آواز ہجوم میں صاف سنائی دیتی ہے۔ صبا نویدی نے اپنے لئے جو راہ متعین کرلی ہے اس پر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ گامزن ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نئے طرز احساس کا یہ شعری مجموعہ "اثر خامہ" ارباب ذوق سے داد حاصل کرے گا اور ہر قاری پر اپنا گہرا اثر چھوڑ یگا۔

———

اثرِ خامۂ علیم صبا نویدی

○ مولانا راہی فدائی، کڑپہ

زندہ زبانوں کی عمر طبعی بہت طویل اور ہزاروں سال پر محیط ہوتی ہے، دنیا کی زندہ زبانیں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، جرمنی وغیرہ جلد عمر رسیدہ نہیں ہوتیں، ان میں قوّتِ نمو کی فراوانی صلاحیتِ رّدوقبول اور قابلیتِ اخذ و انکار کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ اسی لئے عنوانِ شباب سے عہد پیری تک کا سفر صدیوں کی شکست و ریخت اور قرنوں کی تعمیر و تجدید کی دوش پر طے ہوتا ہے، جس زبان میں تخریب و تعمیر کا متوازن تسلسل باقی نہ رہ سکے تو وہ زبان مردہ قرار دی جائے گی، یہی اصول زبانوں کی تاریخ نشوونما کے مطالعہ میں بے حد ممدّ و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

زبانِ اردو مذکورہ فطری اصولوں سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی ہے۔ اردو کے عنوانِ شباب کے دن یہی تو ہیں۔ گیسوئے اردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے" یہ قول کل کی طرح آج بھی سچ ہے۔ بولیاں صدیوں کی ریاضت و مزاولت کے بعد زبانیں کہلاتی ہیں، یہ عہدِ طفولیت سے اسی وقت نکل آتی ہیں جبکہ اُن کے دامن میں ادب کے چار چاند لگ جائیں اور اس کے خانۂ خالی میں ادبی سرمایہ جمع ہونا شروع ہو جائے۔ خدائے برتر کا بے حد فضل و احسان ہے کہ زبانِ اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت جلد اور بڑی تیزی سے جوان ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اس کے مقدر میں صوفیائے کرام کی دعائیں آئی ہیں جن کے سایۂ عاطفت میں اس کا بچپن گزرا ہے اور جن کے

آغوشِ رحمت میں یہ پلی بڑھی اور پھولی پھلی ہے۔ راقم الحروف کا تو یہی عقیدہ ہے کہ اردو کی یہ بیل ہرگز منڈوے نہیں چڑھتی اگر اُن برگزیدہ ہستیوں کے دستِ شفقت کا حسیں لمس اس کو میسّر نہیں ہوا ہوتا۔ ماشاء اللہ ابھی ہزار سال بھی نہیں گزرے کہ اردو زبان بڑے بڑے سورماؤں سے ہاتھ ملانے لگی ہے' دنیا کی اہم ترین زبانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے کے قابل ہوئی ہے اور ہزار ہا مشکلات و مصائب کے باوجود راہِ ترویج کی بے انتہا ناہمواریوں کے باوصف خوب رواں دواں ہے' کہیں رُکنے سستانے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔

بہر حال زبان وادب کی رفتار برقرار رکھنے کے لئے ہر دور میں ادباء و شعراء مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت و ریاضت کرتے آئے ہیں' تبھی تو اس کے سرمایہ میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے' اِسی امرِ واقعہ کے پیشِ نظر راقم الحروف کی ہمیشہ یہی رائے رہی ہے کہ اردو کا خالق چاہے ادیب ہو یا شاعر جو بھی ادب پارہ تخلیق کرے گا اس میں اس بات کا ضرور خیال رکھیگا کہ جس سے کسی نہ کسی سطح پر اردو کا بھلا ہو جائے اور اس کی وہ تخلیق اردو کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث بن جائے' اگر ایسا نہیں ہو رہا ہے تو ایسی تخلیق جو اندھی' گونگی اور بہری ہو اور وہ اپنے آباء و اجداد کے لئے قابلِ فخر یا کم از کم داقع شر نہ ہو تو اس کی زندگی سے موت بھلی ہو گی۔ راقم الحروف کو معاف فرمائیں کہ آج کا کوئی شاعر فرض کیجئے کہ روایتی غزل کہہ رہا ہے اور اس سے اردو زبان کا بھلا کسی بھی سطح پر نہیں ہو رہا ہے تو ایسے شاعر کے کلام کو سننے یا پڑھنے سے کیا حاصل ؟ اس شاعر نامدار کے کلام کو پڑھنے کے بجائے حضرات میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کے کلام کی تلاوت کریں تو اک گونہ ذہنی طمانیت اور قلبی راحت کا تو احساس ہو گا۔ جب تک زبان و ادب میں اس دور کی جدّت شامل نہ ہو گی جس دور میں وہ سانس لے رہا ہے تو ایسے ادب کی تخلیق زبان کے لئے سمّ قاتل ہو گی' خصوصاً شاعری کے تعلق سے یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس میں "ندرتِ خیال" یا جدّتِ الفاظ یا کم از کم کیفیتِ ادا تو ہو ورنہ اس تخلیق کا وجود لایعنی اور ادب کے

لئے لا حاصل سمجھا جائے گا۔ "خیال کی ندرت" سے مراد شاعر ایسا جدید تخیّل پیش کرے جو نہ میر و غالب نے اور نہ اقبال نے پیش کیا تھا۔ "الفاظ کی جدت" کے معنی یہی ہیں کہ ادب پارے میں ان کا استعمال اردو کی لفظیات میں اضافہ متصوّر ہوں۔ اور اُن سے معانی کی نئی جہت کھل رہی ہو، ایجاز و اعجاز ان میں جادو جگا رہے ہوں۔ "طرزِ ادا" میں کیفیت سے یہی مراد لی گئی ہے کہ خیال قدیم ہی کیوں نہ ہو مگر اس کی ادائیگی اس کمال سے کی گئی ہو کہ جس کی وجہ سے ظاہراً نیا خیال محسوس ہونے لگے مگر یہ بہ نظرِ غائر دیکھیں تو اس کے برعکس معاملہ ہو۔

بعض اہل علم شاعری میں اثر آفرینی کی بات کہتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ اثر آفرینی قاری یا سامع کو فوری متاثر کرنے کا نام ہے حالانکہ یہ زعم حقیقت سے دور ہے، اس لئے کہ فوری اثر انداز ہونا وقتی حظ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے جو بہت جلد زائل بھی ہو جاتا ہے بسا اوقات تو بعد ازاں تکلیف دہ بن جاتا ہے درحقیقت اثر آفرینی "تحریصِ فکر" کا نام ہے جو شعر خواں، قاری و سامع کو سوچنے اور بار بار پڑھنے پر مجبور کر دے اور ہر بار اسکو ایک لطیف و خوشگوار کیفیت کا احساس ہوتا رہے اس قدر مکرّر سے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جائیں، معانی و مفاہیم کے نئے جزیرے کی بازیافت ہوتی رہے۔ یہ کیفیت جس ادب پارے میں جس قدر توانا ہوگی اس کی تابندگی اتنی ہی دیر پا ثابت ہوگی۔ تمام دنیا کی ادبیات عالیہ میں سے "قرآن شریف" میں یہ خصوصیت بکمال اتم اور ارفع و اعلیٰ ترین سطح پر محسوس کی جاتی ہے، اس کلام پاک کا قاری کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اس کی ظاہری جاذبیت و باطنی حسن پر اور اس کے صوری رنگ و معنوی کیفیت پر جب بھی غور و فکر کرے گا ایک جہانِ دیگر کا انکشاف ہوتا رہے گا یہی خصوصیت و امتیازی وصف فنِ بلاغت کی اصل و بنیاد ہے۔ اردو میں میر و غالب و اقبال کی شاعری اس لئے عظیم ہے کہ ان کے ہاں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کے معانی کے ست رنگ جلوے دیدۂ بینا کو متحیّر کر دیتے ہیں۔

حضرت میر خدائے سخن کہلاتے ہیں اس پر ہمارا ایمان ہے، جناب غالبؔ

و اقبال پیغمبرانِ اردو ہیں جن کی پیروی جزوِ ایمانِ شاعری سمجھی گئی ہے۔ ان حضرات کے بعد اقلیم اردو میں کوئی پیغمبر نازل کیوں نہیں کیا گیا، اس پہ بحث فی الحال نہیں ہے۔ میر و غالب و اقبال کی عظمت و رفعت اور سیادت و امامت پر امتِ اردو کا اجماع ہو چکا ہے جس کا انکار کوئی فاسق العقیدہ ہی کر سکتا ہے، لیکن تا حال فیض و فراق و جوش کے تعلق سے عظمت و تقدس پر اجماع منعقد نہ ہو سکا، شاید مستقبل میں بھی نہ ہو۔ البتہ مذکورہ بزرگانِ اردو کے اولیاءِ سخن ہونے میں تقریباً اتفاق ہے ان حضرات نے اردو کے سرمایہ میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ فرمایا ہے۔ جس کا اعتراف ہر کسی کو ہے۔ اولیائے اردو کی فہرست کافی طویل ہے اور ان کے درجات کا تعین جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اردو کے نامی گرامی اولیاء میں ولیٔ کامل، شیخ طریقت اردو جناب علیم صبا نویدی ہیں جن کی بیسیوں کتابیں اردو کے سرمایہ میں بلا شک و شبہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بالخصوص آپ کی غزلوں کا جدید مجموعہ "اثرِ خامہ" اپنی اثر آفرینی میں نمایاں دکھائی دیتا ہے، حسنِ ظاہر و نورِ باطن سے آراستہ یہ مجموعہ اہل علم و اصحاب بصیرت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ "نعمت غیر مترقبہ" اس لئے کہا ہے کہ آج اردو دنیا میں بے حد و بے شمار دعوا دارانِ "نبوت اردو" پیدا ہو چکے ہیں مگر کسی کی کوئی تخلیق معجزاتی کیفیت نہیں رکھتی ہے اور نہ ان کی خلاقیت دعویٰ مع الدلیل ثابت ہو رہی ہے ہاں! ایک آدھ شعر کا یا زیادہ سے زیادہ دو چار غزلوں کا بہترین سمجھا جانا "ولایت" کے لئے ہی کافی نہیں چہ جائیکہ "نبوت" کا دعویٰ کیا جا سکے۔ اردو شعراء میں سے بہت ساروں کا بیڑا میر و غالب و اقبال کی اندھی تقلید نے غرق کر دیا ہے۔ جناب مظفر حنفی بڑے ذہین و زیرک شاعر ہیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہا ہے

عظمت سے ہٹ کے جدّت و ندرت کو ناپیے۔ ؎ ہم اور چیز غالب و میر و فراق اور

بلکہ خود کر دکھایا ہے بہر حال جناب علیم صبا نویدی کی "ولایت" میں برصغیر ہند و پاک

بلکہ عالم اردو کے کسی بھی نقاد کو کلام نہیں ہے۔ تمام آپ کے کلامِ بلاغت نظام کے متعرف اور معتقد نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت بیچارے علیم صبا نویدی پر یہ زیادتی ہے۔ خدائے اردو تو تنقید سے بالاتر سمجھے گئے ہیں، اور پیغمبرانِ اردو معصوم گردانے گئے ہیں۔ البتہ اولیاء کے تعلق سے یہ بات وثوق سے کہا جاسکتی ہے کہ ان کے ہاں خوبیاں زیادہ اور خامیاں بہت ہی کم ہوتی ہیں اور وہ بھی دانستہ نہیں بلکہ نادانستہ طور پر ان کے کلام میں در آتی ہیں جو بشری تقاضے کے عین مطابق ہے

جناب علیم صبا نویدی ان معنوں میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز و منفرد ہیں کہ ان کے ہاں جو لسانی و معنوی خصوصیات ہیں وہ اس کمال کی حد تک دوسرے شعراء کے مقدر نہیں بن سکے ہیں۔ علیم صبا صاحب کے ساتھ یہ خدا کا خاص فضل اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی نظر عنایت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی کم علمیت (اسے مراد قطعاً بے علمی نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ ماہر لسانیات ہیں اور نہ ان کے پاس جامعیات کے بڑے بڑے اسناد ہیں) کے باوجود وہ بلند سے بلند اور حسین سے حسین شعر کہنے پر قادر ہیں۔

جناب علیم صبا نویدی کی شعری خصوصیات میں سے سب سے اہم "ندرتِ ترکیب" ہے یعنی وہ دو مختلف لفظوں میں اس طرح پیوندکاری کرتے ہیں کہ اس سے جو "ندرتِ فکر" پیدا ہوتی ہے وہ میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کے ارواح کو ایک ابدی مسرت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ کبھی اس ترکیبی عمل سے "جدتِ الفاظ" کا نورِ فکر کی آنکھوں میں جلائے بصیرت پیدا کرتا ہے جس سے آسمانِ اردو پر نئے نئے چاند ستارے طلوع ہوتے نظر آتے ہیں اور کبھی اس "ندرت ترکیب" کے طفیل ایک عجیب کیفیت ادا" پیدا ہوتی ہے جس کا لطف و ذائقہ زبانِ اردو پر تادیر باقی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو ۔ سرِ فلک بھی کوئی کھیل کود ہوتا تھا
نیلے ارمانوں کی دھرتی پر صبا ۔ کائی خواہش کا ہے منظر نقش گر
کھیتوں پہ اس طرح سے بچھیں سبز چادریں ۔ پیلی رُتوں کا اجلا مقدّر بھی جل گیا
آنکھ نویدی نورانی ۔ دل ہے یقیناً سجدہ گھر
اکیلے پن میں تیرا نام لکھ کر ۔ ہماری انگلیاں راتوں میں روئیں
تار ٹوٹے تو سُر ہوے بیوہ ۔ انگلیوں کا رباب غرق ہوا
ہم اپنے گھر میں سب سے جدا ہو کے رہ گئے ۔ تاریک چاہتوں کی غذا ہو کے رہ گئے
انگلیوں نے جب بھی کی ہے رہبری ۔ کاغذوں کے تخت پر اُترا نصیب
لمحہ لمحہ میری ذہنی انگلیوں کی راہ سے ۔ جتنا سرمایہ تھا فن کا دور ہاتھوں سے گیا
ورق ورق میرے زخموں کا خواب پھیلا تھا ۔ فریب خوردہ لہو کا عذاب پھیلا تھا
صبا نویدی پھینک آؤ ۔ میلی خوشبو، میلے خواب
جب سے ہوئی ہیں میری نگاہیں دراز قد ۔ میرا ہر ایک خیال فلک پوش ہو گیا
پیڑ بیوہ ہو گئے ہیں پتیاں سب اُڑ گئیں ۔ مسکراتے موسموں کی دھجیاں سب اُڑ گئیں
میں کبھی ذہن کے زمینوں سے اُتر آؤں گا ۔ لا کے رکھ دے مرے ہاتھوں میں کھلونا اک دن
لبِ نصیب کی باہوں سے جب سرور اڑا ۔ نہ جانے کتنے ہی ریکھاؤں کا غرور اڑا

جناب علیم صبا نویدی کی یہی کیفیت یعنی "ندرت ترکیب" معنی آفرینی کا سرچشمہ ہے جس سے قاری و سامع کے ذہن و دل نہ صرف سیراب ہوتے ہیں بلکہ ان میں "ہل من مزید" کی خواہش جنم لیتی ہے ۔

نہ روشنی نہ اندھیرا نہ دود ہوتا تھا ۔ مجھے بھی تیری طرح لا وجود ہوتا تھا
در و دیوار میں جو تھا اکیلا ۔ وہ رشتہ اب کہانی ہو گیا ہے
عکس میرا آئینہ در آئینہ ۔ فکر کا تابندہ گوہر نقش گر

آسمانوں کی طرف پاؤں جمانے نکلے — پھول والوں کا وطن لوگ جلانے نکلے
جسے نصیب تھا ادراک و آگہی کا سفر — ورق ورق وہ کہیں باب باب پھیلا تھا
آج سر سے اُتر کے آہستہ — انگلیوں سے مری دماغ لگا
مرے نصیب کے گھر کا دماغ جاگا ہے — سکونِ قلب و نظر کا چراغ جاگا ہے
ورق ورق یہ اچانک بکھر گیا ہے آج — مرا شعور ہمیشہ جو میرے اندر تھا
ہر ایک بھید کا میں نے کیا ہے چاک لباس — بس ایک درد کا سرمایہ تھا، جو دیدتر تھا
ہمارے بعد کوئی شعلہ ساماں — اُفق کی سیڑھیاں چڑھتا نہیں ہے
بسائے ہم نے ہی خوابوں کے شہر پیار کے گاؤں — زمانہ ساز تھے، بے خانماں ہوئے ہم لوگ

جناب علیم صبا نویدی کا یہی کلیدی وصف ہے جس سے فکر و نظر کے مغلق باب وا ہو جاتے ہیں اور اسی صفت خاص کی ضو پاشی دل و دماغ کے تاریک زاویوں کو منوّر و تابناک کرتے دکھائی دیتی ہیں علیم صبا کے طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں بھی آپ کی یہی خصوصیت (ندرت ترکیب) دامنِ دل کی کشش کا سبب ہے، طنز کی تیرشِش اس وصف خاص سے ملکر اثر انگیزی میں سرعت و حدّت پیدا کرتی ہے

چند ریکھاؤں میں لکھا گیا ہے — یہ اگر سچ ہے پھر خدا کیا ہے
سزا دینے والا بھی نکلا بخیل — کہاں اپنا سیراب دامن ہوا
صبا نویدی پاگل ہے — بننا چاہا تھا دریا
جسم و جاں کا سفر عذابوں تک — ڈر خداؤں کا بارگاہوں تک
سچائی کے منڈوے تلے — جھوٹے لوگ ہیں جھوٹا شہر
تمام نیکیاں دریا میں پھینک دی میں نے — مرے گناہ کا ہر سو حساب پھیلا تھا
نہ آسماں نہ سمندر نہ چاند سورج کا — بس آس پاس کے شہروں کا ڈر کھنڈر کو ہے
تیز تر ہیں جب اُڑانیں بخت کی — نیک نامی کیوں پسِ دیوار ہے

تھا غبار آلود شاہی طمطراق ۔ زنگ خوردہ ہر نظر شمشیر تھی
نیکیوں سے صبا گلے ملنے ۔ لوگ آئے ہیں شہرِ رانجب سے

شاعر نہ صرف اپنے اطراف و اکناف کی آب و ہوا کا عکاس اور اپنے قرب و جوار کی فضا کا غماز ہوتا ہے بلکہ "آفاق" کے ساتھ "انفس" کی سیک سیری کرتے ہوئے اس کے عجائبات کا چشم دید گواہ اور باطن کے رموز و اسرار کا ماکی و راوی بھی بن جاتا ہے، یہی اچھی اور بڑی شاعری کی علامت ہے کہ وہ کسی ایک خاص جذبے کی توثیق پر اکتفا نہیں کرتی ہے بلکہ ہمہ جہت تجربات و مشاہدات کی بھرپور تصدیق بھی کرتی ہے۔

جناب علیم صبا نویدی نے اپنی اسی خصوصیت کے ساتھ دروں بینی کے سفر میں حیرانی کا اظہار کیا ہے یہ حیرانی باعث پریشانی نہیں بلکہ یہ ایک شعوری ادارک ہے جس کی عطر بیزی مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔

مثلاً

میں نہ تھا تو میرے اندر کون تھا ۔ قطرہ قطرہ اک سمندر کون تھا
میں تو باہر ہوں ہر طرف موجود ۔ پھر یہ اندر کا سلسلہ کیا ہے
جو سماں باہر ہے میرے، وہ سماں اندر نہیں ۔ لامکاں باہر ہوں لیکن لامکاں اندر نہیں
میرا ظاہر مجھ پر حیراں ۔ میں جب بھی اندر سے نکلا
خبر نہ چھت کو، نہ دیوار اور در کو ہے ۔ میں اپنے گھر میں ہوں میری تلاش گھر کو ہے
میرا اندر ہے مختلف سب سے ۔ میں زمیں پر ہوں اک نئے ڈھب سے
برسوں ترس گیا ہوں ملاقات کے لئے ۔ مجھ میں وہ چھپ کے بولنے والا عجیب تھا
میں بھی ششدر ہوں وہ بھی ہیں حیراں ۔ یہ مہک درمیان کس کی ہے
اپنے ذہنی ارتقا کا زائچہ دیکھے گا کون ۔ معتبر ہم ہیں مگر یہ دور ہے اسناد کا

علیم صبا نویدی صاحب کا خامہ اثر آفرینی کے ساتھ آزاد روی کا بھی متمنی ہے، اسی لئے ان کے ہاں "جنس" کی ہلکی اور لطیف حدّت کے زاویئے بھی روشن نظر

آتے ہیں مگر اس ماحول میں بھی آپ اپنی خصوصیت یعنی "ندرت ترکیب" سے پہلوتہی نہیں کرتے ہیں۔

صدف میں گہر حبس سے روشن ہوا — ضرورت کا آسودہ ساون ہوا
صدف میں گوہر کا نور ہو گا — بسنت رُت کا غرور ہو گا
خشک کنواں تھا بستی کا — گھر میں پھیلا تھا دریا
سج دھج کے اک کرن میرے بستر کو چھو گئی — یادوں کے سب جلوس ہوا ہو کے رہ گئے
ٹھنڈے بستر، جلتے خواب — جسم پراتے میٹھے خواب
درمیانی فاصلے طے ہو گئے — چاہتوں کے پاؤں میں زنجیر تھی
کیا پتہ تھا، تری جلتی ہوئی سانسوں کی قطار — مری سانسوں پہ ہی ڈالے گی بچھونا اک دن
ہماری عمر کی زرخیز سرزمین بھی دیکھ — لہو کے پیڑ سے سرسبز پتیاں نکلیں
خوشبو سے رشتہ ٹوٹا — رات گئے بستر رویا
سوکھی ندی میں غوطہ لگانے کے بعد ہی — آہستہ سرد اس کے لہو کی تپش ہوئی

جناب علیم صبا صاحب منصب ولایت پر فائز ہونے کے باوجود بشر ہی تو ہیں، اسی لئے ان کے ہاں بشری جبلّت کے طور پر چند خامیوں کا در آنا بوالعجبی نہیں ہے۔ یہ علیم صبا جیسے پرگو شاعر کے لئے لازمی ہے مگر آپ کے کلام میں خوبیوں کی کثرت اور سیلاب حسنات کا زور اس قدر ہے کہ اس میں کوتاہیوں کی قلت اور قلم کے زلّات ایک بے حقیقت تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں:—

شعری اظہار صبا فکر جہاتی کی دلیل — فہم سے دور مری ذات کے گھر کا منظر
اس پیڑ کے ہمراہ تھیں موسم کی دعائیں — جس پیڑ میں ہنستے ہوئے پتے تھے زیادہ
جب سے سفر کا ہاتھ مرے ہاتھ آ گیا — سب آسمانی دروازے وا ہو کے رہ گئے
اُتر کر خواہشیں جسموں میں روئیں — نہ رونا تھا جنہیں، خوشیوں میں روئیں
جب آفتابی شہر ہوا تھا لہولہان — تھی موج موج آگ سمندر بھی جل گیا

32

موجوں کا پیرہن پہنے ۔ گویا بیچ بھنور سے نکلا

سانس در سانس ہو بہو نورانی ۔ اپنے اندر وہ سبز باغ لگا

عیب و ہنر کا سرمایہ آخرِ دم وصال ۔ پیراہنِ سفیر میں روپوش ہوگیا

یہ میرا دل بھی سراپا مزار سایۂ صبا ۔ لگاؤ کتبہ کسی نام کا مرے اندر

کس کس نے میرے روپ کی تصویر کھینچ لی ۔ گویا بدن سے چادرِ تقدیر کھینچ لی

بہر حال علیم صبا نویدی کی شاعری اردو زبان میں اضافہ ہی نہیں بلکہ بلاشک وشبہ ادب پر ایک گونہ احسان بھی ہے، جس کا اعتراف نہ کرنا شپرہ چشمی کی دلیل ہے۔ آپ کے شاعرانہ کمال پر ایمان لانا مؤمنِ اردو کے لئے لازمی ہے اور اس کا انکار کفرانِ نعمت اردو متصور ہوگا۔

48

ندی کا بندھ اگر ٹوٹ جائیگا اک دن ۔ ہمارا گھر بھی یہاں کب ٹھہرنے والا ہے

ہر طرف تھی غزل کی طغیانی ۔ کب نویدی جناب غرق ہوا

نئی غزل کے مجاہدوں میں ۔ صبا نویدی ضرور ہوگا

اثرِ خامہ کا تخلیقی اُفق

o سلیم انصاری، جبلپور

اثرِ خامہ علیم صبا نویدی کا چوتھا شعری اظہار ہے، اس سے قبل ان کی غزلیں "نقش گیر" کے نام سے ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آئی تھیں۔ علیم صبا نویدی کے دو شعری مجموعوں کے درمیان تقریباً سات برس کا یہ فاصلہ بظاہر تخلیقی گیپ دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ اسی دوران انکی سات کتابیں شائع ہوئیں جن میں نعتِ پاک کی تین اور ہائیکو کی تین کتابیں بھی شامل ہیں۔ جو لوگ علیم صبا نویدی کو صرف غزلوں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ وہ "نقش گیر" اور "اثر خامہ" کے درمیان اس طویل فاصلے کو غزلوں سے انکی بے توجہی، لاپرواہی اور بے رشتگی پر محمول کر سکتے ہیں لیکن جو لوگ انہیں جنوبی ہند کے بے حد متحرک اور فعال فنکار کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ اس فاصلے کو غزلوں سے، انکے والہانہ لگاؤ اور مزید تخلیقی رنگا رنگیوں کے سمٹنے کا سبب سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "نقش گیر" کے مقابلے میں "اثرِ خامہ" کی غزلیں تنوّع استحکام اور تخلیقی سچّائیوں کے نئے نظام وضع کرتی ہیں۔

جدید غزل کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس نے ادب کا رشتہ معاشرے سے جوڑا ہے۔ اور "ادب معاشرے کا آئینہ" ہے کو صد فیصد درست ثابت کیا ہے کہ آج کا فنکار سب سے پہلے معاشرے کا ایک عام سا آدمی ہوتا ہے اس کے بعد شاعر ادیب اور افسانہ نگار ہوتا ہے۔ علیم صبا نویدی کے یہاں بھی غزل براہِ راست معاشرے سے مخاطب ہے۔ اور اس کے کرب کو اپنا ذاتی کرب سمجھ کر اظہار کے نئے جہانوں سے

آشنا کرتی ہے۔

علیم صبا نویدی نے معاشرے کے کرب کو جہاں ایک طرف اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے وہیں دوسری طرف ممکنہ نتائج کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

میں اگر بولوں تو شعلہ سا یہاں پھیلے گا ‏ ‏ چپ بھی رہ جاؤں تو آہوں کا دھواں پھیلے گا

لمحہ لمحہ مرے احساس کا قاتل نکلا ‏ ‏ مرا چپ رہنا بھی ماحول میں مشکل نکلا

قتل ہو جاتا ہے پر زور ہوا کے ہاتھوں ‏ ‏ مرا ہر شعلۂ اظہار جہاں اٹھتا ہے

سچائی کے لبوں پہ رکھے اس نے لب مگر ‏ ‏ کچھ لوگ بے سبب ہی صبا سے بگڑ گئے

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ جدید غزل کے تقاضوں کے عین مطابق صبا نے معاشرے کو گمنامی بے توجہی اور حق تلفی کے دھوئیں سے بچانے کی کوششوں میں شعلگی قبول کر لی ہے اور یہ شعلگی کبھی انہیں اندرونِ ذات کے مناظر و کائنات دکھا کر اظہار پر اکساتی ہے اور کبھی بیرون ذات بکھرے ہوئے مسائل اور کربناک لمحوں اور سسکتی رینگتی ساعتوں کی گہرائیوں میں اتار کر خود فراموشی کا سبق پڑھاتی ہے۔ شاید اسی لئے علیم صبا نویدی کے یہاں ایسے اشعار وافر مقدار میں موجود ہیں جن میں ان کا اپنا "میں" نمائب رہتا ہے۔

پریشاں نبضیں ٹٹولی گئیں

مگر

مرض میرا مجھ سے نہ پوچھا گیا

اے کاش کوئی ایسا حوصلہ مند شخص دکھائی دیتا جو صبا سے پوچھتا آخر تمہارا مرض کیا؟

اے غزل کے گھر میں اجنبی بن کر رہنے والے، تم نے اپنے لاشعور کو ہی اپنا رشتہ دار کیوں بنایا۔

تم نے اپنے ہاتھوں کی لکیریں کیوں جلا ڈالی ہیں۔ ؟
تم نے اپنی نیندیں دریا میں کیوں پھینک دی ہیں ؟
تم نے خشک آنکھوں سے لہو رونے کا فن کہاں سے سیکھا ہے.؟
تم بار بار بکھر کیوں جاتے ہو؟

لیکن میں جانتا ہوں یہ سارے سوال علیم صبا نویدی سے کوئی نہیں پوچھے گا، وہ ٹوٹ ٹوٹ کر یوں ہی بکھرتا رہے گا، مکتب سے ملے ہوئے گھائل لفظوں کے سہارے، احساس کے قلم کو لہو میں ڈبو کر وہ لکھتا رہے گا، بس لکھتا رہے گا. اور کوئی اس سے اس کا نام تک نہیں پوچھے گا۔

کسی نے مجھ سے مرا نام تک نہیں پوچھا
سنا چکا ہوں کئی شعر ان کہے اب تک

اتنی بے توجہی، تغافل اور دانستہ نظراندازی کے باوجود صبا نویدی مایوس نہیں ہے وہ ہر لمحہ غزل میں جینا چاہتا ہے، حق تلفی، ناانصافی اور نابرابری کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔

نئی غزل کے مجاہدوں میں — صبا نویدی ضرور ہو گا
مرے بغیر نہ منزل نہ منزلوں کا وجود — صبا نویدی مری جستجو سفر کو ہے
سرجھکائے تھی بلندی بھی صبا — صاف گوئی میں بڑی تاثیر تھی
صبا نویدی اسے ڈوب کر بھی پڑھ لینا — ندی کی تہہ میں کسی نے جو بات لکھی ہے

صبا نویدی کے مندرجہ بالا اشعار میں خوش حوصلگی، امید اور جرأت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس کہیں کہیں اتنا شدید ہوتا ہے کہ صبا نویدی ایک مبالغ اور مصلح بن جاتے ہیں لیکن وہ فکر وشعور کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ "اثرِ خامہ" پڑھتے وقت جو بات سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے وہ ان کا

دھیما دھیما سلگتا ہوا لہجہ ہے جس کی تہہ میں غم و غصّہ، عیش و نشاط، بغاوت و نفرت اور احتجاج کی ملی جُلی کیفیات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے اظہار و بیان میں ایک خاص قسم کا تنوع ہے جسے جدید اردو غزل کی صحت مند روایات کا امین کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جدید شاعری نے ہمیں احتجاج کا لہجہ عطا کیا ہے۔ غم و غصے کے اظہار کا سلیقہ، جمالیاتی سوچ اور فکر کے نئے نظریاتی نظام دیے ہیں۔ اور صبا نویدی جدید غزل کے ان جملہ خصوصیات کے علمبردار ہیں۔ ان کے یہاں جمالیاتی اقدار کو مثبت اور منفی دونوں طرح سے برتنے کا سلیقہ بدرجۂ اتم ہے۔ صبا نویدی کا یہی وصف اسے اپنے دیگر ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔

صبا نویدی کے یہاں کسی نام نہاد دانشوری کا اعلان نہیں، کسی نظریاتی وابستگی کا امکان نہیں، کسی تجریدی اندازِ فکر کا جواز نہیں۔ اس کے یہاں صرف اور صرف مشاہدات اور تجربات کی بھٹّی سے نکلا ہوا خیال ہی شعری پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد تقریباً صفر کے برابر ہے، جن کا نہ ہونا، تخلیق کار کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ صبا نویدی کے یہاں فکر کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان کی سوچ میں عصری حسیت کا ملا جلا احساس قاری کو اپنے سحر میں باندھے رکھتا ہے۔

سزا دینے والا بھی نکلا بخیل — کہاں اپنا سیراب دامن ہوا
تمام نیکیاں دریا میں پھینک دی میں نے — مرے گناہ کا ہر سو حساب پھیلا تھا
سانسوں میں آگ، لب پہ دھواں، رخ پہ دھند ہے — تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی
زندگی پھینک کے پر نور سیاہی کی طرف — ہر بدن تھا سفرِ لامتناہی کی طرف
دن میں روپوش ہے اک اور بھی دن — شب میں اک اور ہے شب پوشیدہ
ورق ورق مرے زخموں کا خواب پھیلا تھا — فریب خوردہ لہو کا عذاب پھیلا تھا

یہ وہ اشعار ہیں جنہیں جدید شعری روایات کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔

علیم صبا نویدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھیں اتنی صحت مند تخلیقی سوچوں کا خزانۂ بیش بہا عطا کیا گیا ہے۔

"اثرِ خامہ" کے صفحات پر تخلیقیت پسند سوچوں کا شعری اظہار جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ شعر اپنے لہجے کی وجہ سے ناخوشگوار بھی لگتا ہے کہ علیم صبا نویدی جیسے تخلیقی شاعر کے یہاں کھنک کی بجائے گھن گرج سنائی دے تو یقینی طور پر یہ زیاں صرف صبا نویدی کا ہی نہیں بلکہ ان قارئین اور سامعین کا بھی ہے جو ان کے ادبی سفر کے چشم دید گواہ ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے معترف بھی

مثال کے طور پر

لفظوں کی توپ، سوچ کے ہتھیار کیلئے بھر
آپس میں خود ہی فن کے نگہبان لڑ گئے

گھن گرج کلے ہے جو پہنے ہوئے تابندہ لباس
خاموشی کے وہ بھنور میں نہیں پھنسنے والا

دن کو تپتے ہوئے سورج میں کھڑا کر نن گا
رات پہنچی ہے اندھیروں کے سیاہی کی طرف

بہر حال "اثرِ خامہ" ایک زبردست تخلیقی سچائی ہے، جسے یقینی طور پر بازارِ ادب میں کھرے قدر دان ملیں گے اور اس نایاب شے کو آئندہ نسلوں کی ادبی تربیت کے لئے محفوظ رکھیں گے۔

علیم صبا نویدی "اثرِ خامہ" کے آئینے میں

○ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

مہاتما گاندھی میموریل کالج، سنبھل (یوپی)

علیم صبا نویدی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کے مایہ ناز شہر مدراس کے مایۂ ناز ہونہار فنکار ہیں۔ پروفیسر گیان چند جین کے بقول "ان کی شہرت زیادہ تر ایک جدید شاعر اور جدید اصناف کے وکیل کے طور پر ہے لیکن انھوں نے ماضی سے بغاوت کو اپنا جزوِ ایمان اور حرزِ جاں نہیں بنایا۔ ادب سے ہٹ کر ان کی زندگی میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔"

علیم صبا نویدی کی تخلیقات و نگارشات رسائل و جرائد میں پڑھنے کا موقع ملتا رہا ہے وہ ایک منفرد شاعر" افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ بقول ڈاکٹر عابد صفی "علیم نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ روایتی رنگ کی شاعری بھی کی اور جدید رنگ کی طرف بھی آئے۔ روایتی غزل سے لیکر آزاد غزل تک اور ٹیپ بند نظموں سے لیکر جدید علامتی نظموں اور ہائیکو تک کے سفر میں انھوں نے کتنے ہی اقلیم فتح کر لئے۔ لیکن ان کے قلم کو قرار نہ آیا حتیٰ کہ نثری ادب کی راہیں بھی ان کے زیرِ تصرف آنے سے نہ بچ پائیں۔ آج

وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اسی قدر پختہ کار ہیں جس قدر شاعر کی حیثیت سے
علیم بیک وقت ایک کامیاب ادیب بھی ہیں۔ ایک کامیاب شاعر بھی ہیں اور ایک
کامیاب نقاد بھی اور اس سے بڑھ کر حیرت ناک مختلف نثری و شعری اصناف پر ان کی
مکمل دسترس ہے۔ شعر و نثر کی ہر صنف کو انھوں نے اپنایا ہے اور یوں اپنایا ہے کہ جیسے
وہی ان کا میدان ہو۔

ایک ڈاکٹر عابد صفی ہی کیا پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر
سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر نجم الہدیٰ، ڈاکٹر سیّد حامد حسین، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر
علیم اللہ حالی، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، ڈاکٹر ابو الفیض سحرؔ، ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، ڈاکٹر یوسف
سرمست، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر غیاث اقبال، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، صؔبا اکرام
کاوش بدری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید جیسے مشاہیر ادب و مشاہیر
فن نے علیم صبؔا نویدی کے فن کو سراہا ہے۔ پیش نظر تحریر میں علیم کے فن کا جائزہ لینا مقصود
نہیں یہاں صرف ان کے تازہ مجموعہ کلام "اثر خامہ" (۱۹۹۱ء) پر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے
تاثرات قلم بند کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے "اثر خامہ" میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک یعنی
بیس برس کی غزلوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے جو خوبصورت کتابت و طباعت اور دلکش
گٹ اپ سے مزّین ہے۔

قبل اس کے کہ علیم صبؔا نویدی کے کلام پر کچھ اظہار خیال کیا جائے یہ پتہ لگانا ضروری
ہے کہ خود علیم کا نظریۂ فکر و فن کیا ہے؟ "اثر خامہ" کی متعدد غزلوں میں ان کے نظریۂ فکر و فن
کی نشاندہی ملتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میرے اندر میرے باہر کا سفر | فکر و فن کا جوہری نکلا سفر
ایک عالم میں رہا میرا وجود | سات عالم میں رہا میرا سفر

فکرِ غالب میں دو قدم آگے | شعر گوئی میں پھر صبؔا کیا ہے

شعری اظہارِ صبا فکرِ جہانی کی دلیل   فہم سے دُور مری ذات کے گھر کا منظر

خامۂ نقش گیر میرا فن   شاہدِ باضمیر میرا فن

نئی تاریخ کی زمیں پہ صبا   مہرِ روشن ضمیر میرا فن

کاغذ پہ ہیں نوری کرنیں   صبا نویدی، جدت پیکر

یا وا گوئی سے پاک صاف علیم   یہ نئی داستان کس کی ہے

لہو لہو ہوا جب سے یہ آسمانی سفر   نظر میں رشتۂ فکرِ سراغ جاگا ہے

جہانِ شعر میں مانندِ آفتاب تھا وہ   صبا رسولِ غزل تھا غلام کس کا تھا

مرے شعور کی گہری نظر جو اونچی ہے   کسی ستارے سے مضبوط رابطہ رکھتی ہے

سچائی کے لبوں پہ رکھے اس نے اب مگر   کچھ لوگ بے سبب ہی صبا سے بگڑ گئے

میں اجنبی ہوں ازل سے غزل کے گھر میں مگر   یہ لاشعور مرا رشتہ دار سا کیوں ہے

زوال فن کی سیہ کاریاں مٹانے کو   صبا کے لب سے تھرکتی تجلیاں نکلیں

ذہن کاری نے زندگی بخشی   لفظ گھائل ملے تھے مکتب سے

فکر و احساس کا سرمایہ دو کانوں میں نہ تھا　　اپنا جو کچھ تھا کتابوں میں تھا گلیوں میں نہ تھا

وہ کون شخص ہے رہتا کہاں ہے ڈھونڈ صبا　　نئے شعور کا غماز جس کا چہرا ہے

شعورِ غم نے سکھائے ہیں گفتگو کے رموز　　شعورِ فکر سے معجز بیاں ہوئے ہم لوگ

میں تو دیرینہ روش پر یونہی قائم ہوں صبا　　کر گیا کتنی ہی صدیوں کا احاطہ احساس

ٹپکا لہو جو آنکھ سے دل میں خلش ہوئی　　لوح و قلم کی ہم سے بہت پرورش ہوئی

وہ لوگ کہتے ہیں بے باک آدمی تھا علیم　　صبا نویدی سے جو لوگ شاعری میں ملے

ہے انوکھا مری تخلیق کا رنگ　　بے ادب میں ہے ادب پوشیدہ

مذکورہ بالا اشعار کے ظاہری و باطنی پہلوؤں پر غور کرنے سے ایسے کئی گوشے نمودار ہوتے ہیں جن کے توسط سے شاعر کے عمومی رجحانات و میلانات کی پہچان مشکل نہیں ان سے یہ بھی مترشح ہو جاتا ہے کہ وہ کسی خاص مکتبۂ فکر یا دبستان خیال کے اسیر نہیں ہیں وہ زندگی کے مشاہدات و تجربات کا براہ راست ادراک و احساس رکھتے ہیں اور انھیں اپنے اشعار میں فنکارانہ پختگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فنکار عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حساس اور دوا ہوتا ہے۔ حسّاس و خلّاق ذہن گرد و پیش کے حالات و واقعات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا زندگی کی تہہ داریاں، نشیب و فراز اور اہم مسائل کو اس کی شدید حسیت موضوعِ سخن

ماننے پر مجبور کرتی ہے اور یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہر لمحہ گرد و پیش ، باطل قوتوں سے برسرِ پیکار رہتا ہے اور مضرت رساں عناصر پر کاری ضرب لگاتا ہے۔
علیم صبا نویدی نے بھی یہی فریضہ انجام دیا ہے انھوں نے روایت پسند فنکار ہونے کے باوصف عصری تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ وہ رجعت پسندی و دقیانوسیت کے خلاف سینہ سپر نظر آتے ہیں انھوں نے کلاسیکی اور جدید اقدار کو بڑی خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے قدیم و جدید قدار کا یہ حسین امتزاج انھیں ہمعصر شعراء میں منفرد درجہ عطا کرتا ہے۔ وہ روایتی ہوتے ہوئے بھی جدید ہیں اور جدید ہوتے ہوئے بھی روایتی۔ وہ کلاسیکی روایت کے امین تو ہیں لیکن اسکی اندھی تقلید کے روادار نہیں۔ وہ مثبت اقدار کو محفوظ رکھنے اور منفی قدار سے گریز کرنے کے حامی ہیں۔

صدیوں کے درمیان ہوں میں بھی تو اک صدی
اک بار مجھ کو اپنا سمجھ کر پکار لے

کس روپ پہ میرے کوئی افسانہ لکھے گا
میں ایک تھا لیکن مرے چہرے تھے زیادہ

تخلیق غم و کرب کے بے ساختہ بادل
اندر ہی مرے لوٹ کے برسے تھے زیادہ

لکھوا دیئے ہیں اوروں نے دیوار و در پہ نام
اک ہم تھے اپنا نام و نسب بولنے نہ پائے

پھول تھے نہ پھول سا کوئی بدن
میرے کمرے میں معطر کون تھا

وجود اپنا سمٹ کر اس مکاں میں
مقام لامکانی ہو گیا ہے

دھڑکنوں کے آئینوں میں عکس میرا منکشف
اپنے اندر ہی سے پوچھو میں کہاں اندر نہیں

لگی اس قدر سبز پتوں کو آگ
جلے پھول پھل داغ روشن ہوا

اک ناگ بن کے ایسے ڈسی ہے خموش آگ
آئینۂ حیات کا جوہر بھی جل گیا

وقت بھی اس کا حکومت بھی تھی اس کی اپنی
آج تک جس نے کوئی بھید نہ اپنا کھولا۔

ہم یہ سمجھے تھے کہ زخموں کا سفر ختم ہوا
اب کے سانسوں میں بھی زخموں کے ٹھکانے نکلے

یہ اشعار تو بے ساختہ زبان قلم پہ آ گئے" اثر خامہ" اسی طرح کے منفرد اشعار کا

ایک خوبصورت مجموعہ ہے جس میں صاحب " اثر خامہ " کے تجربات و مشاہدات کی آئینہ داری بھی ہے ذاتی احساس و کرب کی عکاسی بھی اور کائنات حقائق کی ترجمانی بھی۔ ان کے کلام میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اقدار کا المیہ بھی ہے اور ان کی ترقی یافتہ تعبیریں بھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان کے یہاں روایت کے ساتھ ساتھ درایت کا التزام بھی ہے وہ نامانوس و بوجھل تشبیہات و استعارات سے کلام کو گنجینۂ معنی کا طلسم نہیں بناتے بلکہ نہایت دلکش پیرایہ اظہار سے احساسات کو قاری تک پہنچاتے ہیں اور بقول شخصے شعری حسن کا وہ تاثر چھوڑتے ہیں جو دیر تک ذہن پر طاری رہتا ہے اور یہی اچھے شعر کی پہچان ہے۔

علیم صبا نویدی کے تخلیقی سفر میں زندگی کی دھوپ چھاؤں کے اثرات نمایاں ہیں ان کے یہاں زندگی کے کرب کا احساس پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے لیکن وہ غم و آلام کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ وہ غم و آلام کو زندگی سنوارنے اور نکھارنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں مشہور ادیب و نقاد سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں۔

" مجھے علیم صبا نویدی کے اشعار میں معانی کی دوہری سطح نظر آتی ہے ایک سطح پر یہ علیم صبا کی اپنی واردات ہیں تو دوسری طرف گہری سطح پر ان کے ذریعہ علیم نے اپنے عصر سے اپنا مضبوط رابطہ استوار کیا ہے ۔ یوں دیکھیں تو علیم صبا کی غزلوں کے بیشتر اشعار عصری شعور کا آئینہ قرار پاتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا جیسے جید نقاد و شاعر کا کہنا ہے۔

" علیم صبا نویدی کی غزلوں میں دروں بینی کا رجحان خاصا توانا ہے۔ وہ کائنات دل کا بار بار ذکر کرتے ہیں کبھی اسے اندر کا دریا قرار دیتے ہیں کبھی اسے آسمان کا گرد انتے ہیں اور کبھی اسے سمندر بھر سیپ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ گویا ان کے بطون میں کہیں موجود ہے اور وہ ایک دن نہ صرف خود اس سے پوری طرح آشنا ہو سکیں گے بلکہ اس کی چمک دل کے نہاں خانے سے نکل کر پورے عالم میں پھیل جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے لہجے میں تازہ کاری

کے جو شواہد نظر آ رہے ہیں ان سے ان کی غزل کی انفرادیت شوخ تر ہو گئی ہے"۔

لمحہ لمحہ میری ذہنی انگلیوں کی راہ سے — جتنا سرمایہ تھا فن کا ، دور ہاتھوں سے گیا

جسے نصیب تھا ادراک و آگہی کا سفر — ورق ورق وہ کہیں باب باب پھیلا تھا

رقیب پھول سے مارے یا سنگسار کرے — تمہارے ہاتھ کے پتھر کا خوف سر کو ہے

نہ آسماں نہ سمندر نہ چاند سورج کا — بس آس پاس کے شہروں کا ڈر کھنڈر کو ہے

یوں تو سب چہرے مرے اپنے ہی چہرے تھے مگر — مجھ سا تنہا کوئی اس شہر کے لوگوں میں نہ تھا

بسائے ہم نے ہی خوابوں کے شہر پیار کے گاؤں — زمانہ ساز نہ تھے بے خانماں ہوئے ہم لوگ

مری میّت یہ بھی دینے کو گناہوں کا ثبوت — آج ہر سمت سے بے رنگ دُعا آئی ہے

منظر کی آنکھ نم تھی اور فضا تھی زرد رنگ — قتل گاہوں میں جہاں سچائیاں خاموش تھیں

میرے اندر کے گنہ گار کا لینے کو حساب — کاغذی شہر میں اترے ہیں فرشتے میرے

میں نے سچائی کی سولی کو مقدّر جانا — جب زمانہ تھا یہاں جھوٹی گواہی کی طرف

آج بھی گھومتی رہتی ہے سہاگن کی طرح — کوئی قوّت مری ناکردہ گناہی کی طرف

موسموں کی بیوگی کو ہم نے دی دوشیزگی — آپ لیکن باغ کو بس خوشنما کہتے رہے

کیوں ہاتھ پاؤں تیزی سے پھیلائے گاؤں کو — بیمار روشنی کی صدا دے رہے ہیں لوگ

مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علیم صبا نویدی کا کلام ہر لحاظ سے چونکا دینے والا ہے اور ان کا یہ مجموعہ کلام بنظر تحسین پڑھا جائے گا۔

مطبوعہ منصف حیدرآباد
اپریل 1993ء

جدید اردو شاعری کا مجاھد

○ ڈاکٹر مقبول فاروقی، آندھرا یونیورسٹی، والٹیر

اردو غزل نے اپنے طویل سفر میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں کبھی فکری جمود نے اس پر کڑا وقت لایا تو کبھی مغرب کی کورانہ تقلید نے اس کو گردن زدنی قرار دیا لیکن غزل نے نہ صرف یہ کہ اس طرح کی وقتی یلغاروں کو جھیل لیا بلکہ ہر بار ایک نئی توانائی اور تازگی کے ساتھ ابھر کر اپنے مخالفین کا منہ بند کر دیا اور اردو شاعری میں اپنے مقام اور اہمیت کو تسلیم کروالیا۔ آج جبکہ پھر بعض حلقوں سے غزل کی مخالفت میں آواز اٹھائی جارہی ہے تو یہی لگتا ہے کہ تاریخ پھر خود کو دوہرائے گی " اثر خامہ " کی غزلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو یہی خیال آتا ہے ـــــ غزل کی بظاہر " تنگنائے " میں فکر و اظہار کی ایک دنیا سموئی جاتی رہی ہے۔ دیگر اصناف شاعری کی افادیت سے انکار نہیں لیکن ہم یہ کیوں فراموش کردیں کہ غزل ہماری شاعری کی شناخت بن چکی ہے غزل جہاں ہماری داخلی کیفیات کی عکاس رہی ہے۔ وہیں خارجی حالات کو آئینہ دکھانے کا سلیقہ بھی اس کے اندر موجود ہے بلکہ غزل نے یہ فریضہ بھی زیادہ موثر اور زیادہ دلآویز انداز میں انجام دیا ہے۔ غزل کی کامیابی کا انحصار شاعر کی اپنی صلاحیتوں اور اسکی

فنی استطاعت پر ہوتا ہے۔ شاعر کی ناکامی کے لئے غزل کے فارم کو موردِ الزام ٹھہرانا ظاہر ہے کہ درست نہ ہوگا ۔۔۔ "اثرِ خامہ" کی غزلیں اسی بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ایک سچا فنکار غزل کے اندر کیسے کیسے امکانات کا سراغ لگاتا ہے۔

علیم صبا نویدی میدان شعر و ادب کا ایسا مرد مجاہد ہے جو کبھی فارغ نہیں بیٹھتا۔ پچھلے دو تین دہوں میں علیم صبا نویدی نے ایک درجن سے زیادہ شعری مجموعے پیش کئے ہیں۔ نثری تخلیقات اس کے علاوہ ہیں ان کی یہ تخلیق لگن غیر معمولی بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

علیم صبا نویدی ایک ذہین اور حساس فنکار ہیں ان کا فن زندگی کے متضاد پہلوؤں سے ان کی گہری آگہی کا آئینہ ہے۔ ان کا تخیل تہہ در تہہ پیچیدہ مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔۔۔ غزل کی روایات کے پاس و لحاظ کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے اور طرزِ اظہار میں ایک غیر معمولی تنوع اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تنوع تجربے کا بھی ہے اور اظہار کا بھی۔ یہ دراصل شاعر کی عصری حسیت ہے جو اس کی تخلیقات میں تازہ کاری کے پھول کھلاتی ہے۔

علیم صبا نویدی کے یہاں فن اظہارِ ذات کا وسیلہ بھی ہے اور گرد و پیش کا آئینہ بھی ۔۔۔ "اثرِ خامہ" کی غزلیں شاعر کی داخلی کیفیات اور خارجی حوادث دونوں پر محیط ہیں ۔۔۔ غزل میں فکری موضوعات کی پیشکشی علیم صبا نویدی کے کلام کا ایک حاوی عنصر ہے "اثرِ خامہ" کی غزلوں میں بھی یہ فکری عنصر حاوی نظر آتا ہے۔

ایک اور چیز جو صبا نویدی کی غزلوں میں خاصی نمایاں ہے وہ ہے شاعر کی دروں بینی۔ یہ کیفیت ایک مخصوص طرح کا ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اپنے گرد و پیش کے ماحول پر چھائی ہوئی محرومی و مایوسی کی تاریک فضا سے اکتا کر اپنی ذات کے اندر جھانکتا ہے۔ اس کی ذات کا اندرون نہایت روشن اور تابناک ہے جہاں اسے ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے یہاں اس کی عزتِ نفس اور خود اعتمادی

نمو پاتی ہے اور یہیں سے ایک نئے حوصلے اور ایک نئے عزم کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

متعدد شعری مجموعوں کے بعد اب "اثرِ خامہ" کی شاعری نے صبا کے فکر و فن اور لب و لہجہ کی انفرادیت کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔

اپنے اس مطالعے کی وضاحت کیلئے "اثرِ خامہ" سے کچھ شعر یہاں پیش کرتا ہوں۔

ایک عالم میں رہا میرا وجود
سات عالم میں رہا میرا سفر

ایک قطرے میں سمندر کے ہیں بھید
آخری حد چھو گیا پہلا سفر

نیلے ارمانوں کی دھرتی پر صبا
کالی خواہش کا ہے منظر نقش گر

وہ قطرہ جو وسعت میں تھا کائنات
سمندر کے سینے کی دھڑکن ہوا

نہ آسماں نہ سمندر نہ چاند سورج کا
بس آس پاس کے شہروں کا ڈر کھنڈر کو ہے

سوچوں کی چاندنی رات میں لفظوں کے درمیاں
اوراق کی ہتھیلی پہ پیدا ہوا تھا میں

لوگوں نے اپنے سینوں پہ پتھر جو رکھ لئے
اس دور نے دعاؤں سے تاثیر چھین لی

خواب شہروں کے اٹھا کر پھینک دو
آ گئے جنگل میں بس لینے کے دن

رکھا گیا کاغذی خانوں میں خزانے کتنے
یاد رکھیں گے اسے لوگ نہ جانے کتنے

صد رنگ رت بہار کی آتے ہی کیوں صبا
طاقت تمام پیڑوں کی پھولوں میں آ گئی

کسی نے مجھ سے مرا نام تک نہیں پوچھا
سنا چکا ہوں کئی شعر ان کو اب تک

میری آواز کا بس اتنا کرشمہ ہے کہ اب
میرا احساس لگے ہے یہاں سب کا احساس

کسی پہاڑ سے ٹکراؤ اور برس جاؤ
بدن میں کالی گھٹاؤں کا رس لئے کیوں ہو

جو سماں باہر ہے میرے وہ سماں اندر نہیں
لامکاں باہر ہوں لیکن لامکاں اندر نہیں

میرا ظاہر مجھ پہ حیراں
میں جب بھی اندر سے نکلا

کسی کا داخلہ دشوار ہے مرے اندر
کہ میری ذات ہی دیوار ہے مرے اندر

تم کو باہر کا سفر راس آگیا
ہم مگر اندر کے اندر رہ گئے

بستر بچھا کے نیند سے لپٹے ہی تھے کہ رات
اک روشنی سی تن کے اندھیروں میں آگئی

علیم صبا نویدی کی شاعری

○ ڈاکٹر جاوید اشرف فیض اکبر آبادی

اس کارگہہ شیشہ گری میں ایک اچھے شیشہ گر کا نام علیم صبا نویدی ہے۔ صبا صاحب نظم و نثر کے مخلص شیشہ گر اور جدید نقد و نظر کے تازہ و بہتر آئینہ گر ہیں۔

شہنشاہِ سخن میر محمد تقی میر اکبر آبادی (ولادت۔ ۱۷۲۴ء، وفات۔ ۱۸۱۰ء) نے کہا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

اور راقم الحروف (جاوید اشرف فیض اکبر آبادی) نے بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف، مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن، کے تحت کہا ہے ؎

اے فیض نزاکت کا ہے آئینہ نظر میں
چاہت لئے درپن کا زمانہ بھی عجب ہے

سید علیم الدین المعروف علیم صبا نویدی صاحب کو اُن کے پیر و مرشد حضرت خواجہ قدسی شاہ مولانا اسماعیل رفیعی مدظلہٗ کے رشد و ہدایت کے نور و نکہت نے اُن کے اندر کے سفر کے آئینے کو منوّر و معطّر کیا تو انہوں نے (علیم صبا نے) کہا ہے

سانسوں سے دُعاؤں کا سفر کرنے لگا ہوں
اِک ذات کے آئینہ میں گھر کرنے لگا ہوں

(وزن :- بحر ہزج، مثمن اخرب مکفوف محذوف، مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن)

مندرجہ بالا اشعار میں سانس، شیشہ گری، نزاکت، چاہت لئے درپن سانسوں سے دُعاؤں کا سفر اور اِک ذات کے آئینے میں گھر، وغیرہ جیسے ٹکڑے نہایت لطیف جذبات اور باریک کام کی طرف ہماری توجّہ مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ خاص کر علیم صبؔا نویدی کا شعر جدید لب ولہجہ کے باعث ذوقِ سماعت کو زیادہ بھلا معلوم ہو رہا ہے۔

علیم صبؔا نویدی صاحب کے اثر خامہ کی شدّت اور وسعت شہنشاہِ فکر وفن مرزا محمد اسداللہ خاں غالبؔ اکبرآبادی (ولادت - ۹ فروری ۱۷۹۷ء بمقام آگرہ بروز اتوار یعنی ۸ رجب ۱۲۰۸ھ، وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بمقام دہلی) کے پہلے تخلّص "اسدؔ" کے ساتھ بحر مجتث / مثمن / مخبون مقصور، مفاعلن فعِلن / فعْلن فعلات / کے تحت ملاحظہ کرنی چاہیئے ؎

بفیضِ فکرِ اسدؔ پھیلتا گیا ہے صبؔا
وگرنہ اس کو بھی تذرِ جمود ہونا تھا

فکر وفن کا پیکر یعنی ایک سخنور کسی صحرا میں رہ کر بھی ایک دریا کی طرح ہوتا ہے۔ راقم الحروف (جاوید اشرف فیض اکبرآبادی) نے علیم صبؔا نویدی پر بحر رمل مسدس محذوف، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، کے تحت ایک شعر کہا ہے ؎

فیض سے پوچھو، صبؔا کیا ہے صنم کا مرتبہ
ایک دریا پیاس کے صحرا میں ہے

تامل ناڈو (ہندوستان) جیسے اردو کے سرزمین صحرا میں آباد علیم صبؔا نویدی صاحب کی شعری و ادبی خدمات مندرجہ بالا شعر کی غمّاز ہو سکتی ہیں۔

بحرِ رمل، مثمن مجنون ابتر، فاعلاتن فَعلاتن فَعلاتن فعلُن کے تحت بقول راقم الحروف یعنی جاوید اشرف اکبرآبادی سے

فکر و فن موج کی صورت میں ہے آکر دیکھو
ایک کوزے میں سمایا ہے سمندر دیکھو

علیم صبا نویدی صاحب کا پہلا سفر ہی شعری و ادبی خدمات کی آخری حد چھونے میں کامیاب ہوا ہے۔ کیوں کہ صبا جیسے فکر و فن کے ایک قطرہ میں سمندر کا راز مخفی ہے۔ بحرِ رمل، مسدس محذوف، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن / فاعلات، کے تحت بقول خود صبا۔

ایک قطرے میں سمندر کے ہیں بھید
آخری حد چھو گیا پہلا سفر

چاند بدنوں کے قرب یا گل بدن حضرات کی چاہت ہمیں لذّتِ خاص سے بھی ہمکنار کرتی ہے اور عمر بھر کے لئے نہ مٹنے والے زخم بھی فراہم کرتی ہے۔ کوئی پھول بدنوں کے تغافل یا بے وفائی سے عاجز آ جاتا ہے تو بقول صبا، بحرِ خفیف، مجنوں محذوف، فاعلاتن مفاعلن فَعِلن، کے تحت کہہ اٹھتا ہے

چاہ پھولوں کی چھوڑ دے بھی صبا
پھول کی چاہ میں ہی داغ لگا

یہاں "چھوڑ دے بھی" کی جگہ "چھوڑ بھی دے" بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ صبا کے اِس شعر سے

میں کہاں دفن کروں اپنے اکیلے پن کو
ہر طرف شور ہے مجمع ہے نئے لوگوں کا

میں "اکیلے پن" کی جگہ "پرانے پن" بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ صبا کا یہ

شعر بحرِ رمل، مثمن مجنون، ابتر، فاعلاتن فعلاتن، فعلاتن فعلن، کے تحت ایک اچھا، غمزہ بھرا معنی خیز شعر ہے۔

جدیدیت کا شوق اچھی چیز ہے لیکن جدیدیت کا بھوت اچھی چیز نہیں

بحرِ رمل، مثمن مجنون، ابتر، فاعلاتن فعلاتن فعلن کے تحت بقول صبا ؎

وہ کہاں آنے کو تیار تھا اس سمت صبا
وقت لے آیا اُسے اپنی تباہی کی طرف

اور ؎

میں تو دیرینہ روش پر یوں ہی قائم ہوں صبا
کر گیا کتنی ہی صدیوں کا احاطہ احساس

بے کار یا بکواس کی حد تک "جدیدیت" غالباً ہر نئے ہندی شاعر کو تباہ کرتی جا رہی ہے۔ کہیں یہ ہر جدید اُردو شاعر کو بھی برباد نہ کر دے؟!

ع "خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے!"

پروفیسر کلیم الدّین احمد عظیم آبادی، ڈاکٹر تھامس گرے، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، وغیرہ قسم کے لوگوں میں (PREVIOUS KNOWLEDGE) کا فقدان ہونے کی صورت میں اُن پر بے کار یا بکواس جدیدیت سر چڑھ کر بولتی رہی تھی بولتی رہی ہے اور بولتی رہے گی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جدید روش پر چلنے کے باوجود سیّد علیم صبا نویدی صاحب (تاریخِ ولادتِ ۲۸ فروری ۱۹۴۲ء) "قدیمیت" یا اپنی "محترم روایت" سے پوری طور پر کبھی باغی نہیں ہوئے۔ وہ "مسلکِ شعر و شاعری" پر گامزن رہے ہیں۔ بحرِ ہزج، مسدس محذوف، مفاعیلن مفاعیلن مفولن، کے تحت کہتے ہیں

فنِ شعر و سخن کے عرش پر بھی
صبا سے لوگ با مسلک گئے تھے

صبا، تغزل یا "میریت" (میں تغزل کو "میریت" اور تخیل کو "غالبیت" کہتا ہوں۔ فیض اکبرآبادی) اور تخیل یا "غالبیت" کے طفیل روایت کا پاس رکھتے ہوئے بحر مضارع، اخرب مکفوف محذوف، مفعول فاعلاتن مفاعیل فاعلن، کے تحت کہتے ہیں۔ ے

صدیوں کے بعد بھی صبا اوروں کے واسطے
ہم جس پہ چل رہے تھے وہ مشکل روش ہوئی

جس طرح مرزا اسداللہ خاں (اسد و غالب) نے بحر ہزج، مثمن سالم/مقبوض، مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن/مفاعلن، کے تحت کہا تھا۔ ے

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے "رنگِ بہار ایجادی" بے دِل پسند آیا

صبا کی شاعری اور حالاتِ زندگی دونوں پر سبھوں کی نظریں کہاں پڑی ہیں۔ بحر متقارب، مثمن محذوف، فعولن فعولن فعولن فَعَل، کے تحت صبا نے کہا ہے۔ ے

صبا پر مضامین لکھے گئے
مگر اس کے دکھ پر نہ سوچا گیا

صبا کو سمجھنا آسان نہیں۔ اُن کو سمجھنے کے لئے پہلے راقم الحروف یعنی جاوید اشرف فیض اکبرآبادی کے بحر رمل مثمن مخبون، ابتر، فاعلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فعْلن، کے تحت اِس شعر پر غور کرنا چاہئے۔ ے

غم میں ہے کتنا مزہ، درد کی لذّت کیا ہے
مجھ کو معلوم ہُوا آج محبّت کیا ہے

اس کے بعد بحر رمل، مثمن محذوف، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، کے تحت

صبا کا یہ شعر دیکھنا چاہئے۔

ایک مبہم زاویہ جو دائرے میں تھا صبا
اس کی دھڑکن کا اجالا اس صدی کے پار تھا

سوچ کے سفر میں نئے نئے احساسات اور امکانات روشن ہوتے رہتے ہیں۔ بحر محبّت، مثمن مجنون، ابتر، مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعْلن / فعِلن کے تحت صبا کہتے ہیں ؎

ہر ایک سوچ کی کھڑکی سے پھوٹتی ہے کرن
نہ جانے کون سا مینار ہے مرے اندر

میں (فیض اکبرآبادی) نے کہا ہے ؎

کہتے ہیں مجھ کو اہلِ ادب فیضؔ
ثانیٔ غالبؔ و میرؔ ہوں میں

علیم صبا نویدی کہتے ہیں ؎

تلاشِ مسلسل صبا ہے عبث
نہیں مجھ سا بہتر سخن ور یہاں

شہرِ اظہارِ غزل میں اب علیم
مجھ سے افضل اور بہتر کون تھا

صبا کئی جہت سے احساس کے آنسو بہانے کے لئے مناسب رہے ہیں ؎

میں مناسب تھا صبا پھوٹ کے رونے کے لئے
بعد غالبؔ کے مرے گھر وہ بلا آئی ہے

فکرِ غالبؔ میں دو قدم آگے بڑھنا فکرِ بے دلِ سے قریب ہونا ہو سکتا ہے۔ ایسا کوئی سوچ سکتا ہے۔ صبا کہتے ہیں ؎

فکرِ غالبؔ ہیں دو قدم آگے
شعر گوئی میں پھر صباؔ کیا ہے

جہانِ شعر میں مانندِ آفتاب تھا وہ
صباؔ رسولِ غزل تھا، غلام کس کا تھا

لیکن زمانہ ہر اچھّے یا بڑے فنکار کے ساتھ پہلے بے اعتنائی سے کام لیتا ہے ؎

فکرِ غالبؔ کے طرف دار سہی آپ صباؔ
یوں تو ہر دَور ہے فن کار کو ڈسنے والا

بعد میں کسی کسی کے ساتھ انصاف کرتا ہے زمانہ بھی اور وہ آسمانِ ستم ایجاد بھی۔

صباؔ خود سے اور کبھی خُدا سے کہتے ہیں ؎

اور بھی گھر ہیں بھرے شہر میں برباد صباؔ
ہر تجلّی کا صحیفہ مرے گھر پر نہ اُتار

جناب اِسکاوٹ (SIR WALTER SCOTT 1771 TO 1832) نے کہا ہے ؎

Breathes there the man with
Soul so dead,
Who never to himself hath said

علیم صباؔ نویدی کچھ کہنے سے قبل کاشانۂ جگر یا ایوانِ فیض خاص کی دیوار پھلانگ کر منظرِ شب خون کو دیکھ لیتے ہیں۔ تب صفحۂ قرطاس پر نئے خیال کا مجسّمہ اٹھا کرتے

ہیں۔ ان کا نام صفحۂ تاریخ اردو شعر و ادب پر ضرور لکھا جانا چاہیئے۔ وہ نئ اور اچھی غزل کے مجاہدینِ خاص میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مہکے مہکے گرم بستر پر پگھلتے کی خاطر صبا یہاں بھی فراق کی طرح کتنی سانسوں سے نکلتی نرمیاں نہاں و عیاں ہیں۔

صبا کی آواز کا بس اتنا کرشمہ ہے کہ اب اُن کا احساس سب کا احساس لگنے لگا ہے۔ اُن کے یہاں (Powerful Feelings) کا (Spontaneous Expression) موجود ہے۔

جانسن صاحب (BENJOHNSON - 1573 TO 1637) نے کہا ہے

In small proportions we just
beauties see,
And in short measures liife
may perfect be,

علیم صبا نویدی بھی ایک چھوٹی سی چیز کا نام ہے۔ لیکن یہی چھوٹی سی چیز بہت وسعت اور شہرت رکھتی ہے۔ جس طرح "غزل" کا ایک شعر بہت وسعت، شہرت اور شرفِ قبولیت خاص و عام رکھتا ہے (کلیم الدین احمد، تھامس گرے، اور ستیہ پال آنند قسم کے لوگ میری اس بات پر غور و خوض کریں)۔

بقول صبا ؎

افق افق ہے صبا نویدی
پست ہے لیکن اپنے قد میں

میری قسمت میں سمٹ جانا ہی لکھا تھا صبا
میرے ادراک نے پھیلاؤ کا رستہ کھولا

صبا نے جدید اسلوبِ شعر و سخن میں نغمگی اور اصل شاعری کو مرنے نہیں دیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے ہمعصروں کی خشک روش سے نالاں ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہر ایک سمت ہے نغموں کی موت کا ماتم
ہر ایک ساز یہاں بے صدا سا لگتا ہے

وہ لوگ کہتے ہیں بے باک آدمی تھا علیم
صبا نویدی سے جو لوگ شاعری میں مِلے

بحر خفیف، مخبون محذوف، فاعلاتن مفاعلن فعِلن / فعِلات، کے تحت پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری نے کہا ہے ؎

زندگی عین دیدِ یار فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی !

بحر رمل ہزج رمل مزاحف، مثمن مکفوف اخرم، مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن، کے تحت راقم الحروف جاوید اشرف فیض اکبر آبادی نے کہا ہے ؎

معلوم ہے کہ ہر پَل تو میرے روبرو ہے
پھر بھی مِری نظر کو تیری ہی جستجو ہے

بحر ہزج، مسدس محذوف، مفاعیلن مفاعیلن فعولن، کے تحت سید علیم صبا نویدی نے کہا ہے۔ ؎

اگرچہ آئینہ اک روبرو ہے
نگاہوں کو تمہاری جستجو ہے

دید یا دیدار یعنی کسی کا روبرو ہونا (اور اس کا درشن کرنا) اور جستجو یا تلاش یعنی عرصۂ ہجر میں کسی کا متلاشی ہونا۔ بالکل یہی بات ہے، کیونکہ جدائی نہیں تو جستجو بھی نہیں۔

مندرجہ بالا اشعار میں صبا صاحب کا شعر زیادہ مختصر اور اعلیٰ ہے۔

ڈاکٹر حبیب اللہ غریب بدایونی صاحب نے کہا ہے۔ سیّد علیم صبا نویدی کی شاعری پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔"

یس۔پی۔ انسان پریم نگری صاحب نے کہا ہے۔" پروفیسر ڈاکٹر سیّد بشیر بدر کانپوری، شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی، وغیرہ کے کلام میں جتنے اغلاط و اسقامِ سخن موجود ہیں اُتنے سیّد علیم صبا نویدی کے کلام میں نہیں۔"

غلطیاں تو میر، غالب، اقبال، وغیرہ کے کلام میں بھی موجود ہیں لیکن اس وجہ سے متذکرہ شعرائے کرام کی شہرت اور عزت میں کوئی خاص کمی نہیں آسکتی۔

علیم صبا نویدی صاحب نئی اور اچھی شاعری کے (Amorist) ہیں۔ لیکن ان کی شاعری (Poetry) پُرانے طرز کے لوگوں کو (Embril) نہیں کرتی۔ کیوں کہ وہ جدید لے ہیں۔ مگر بالکل جدید لے نہیں۔ وہ اُس عظیم شاعر کی طرح مرطف و بلند ہیں جو قدیم و جدید دونوں ادب کا احاطہ کرتا ہے جیسے فیض۔

ٹھیک فیض ہی کی طرح صبا کی شاعری ہمیں بے جا (Perplexity) سے دُور رکھتی ہے۔

پرنسپل حضرت عبدالجبّار غنی رانچوی صاحب کہتے ہیں۔

"سیّد علیم صبا نویدی صاحب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا شاہ فاضل بریلوی رح کی طرح مختلف و متعدد علوم اور جذبات واحساسات کے سخن ساز (Quibbler) ہیں۔"

علیم صبا نویدی صاحب کے یہاں اچھے اشعار کی کمی نہیں۔ اُن کے یہ اشعار دیکھئے اور سوچتے اور جھومتے رہیئے۔ سے

سرحد سے کائنات کی نکلا ہُوا تھا میں
سورج کو اپنے ہاتھ سے تھاما ہُوا تھا میں

تاریخ میری ذات سے آگے نہ بڑھ سکی
کچھ اس طرح سے صدیوں پہ بکھرا ہُوا تھا میں

سوچوں کی چاند رات میں لفظوں کے درمیان
اوراق کی ہتھیلی پہ پیدا ہُوا تھا میں

شبِ فراق پہ خوابوں کے کیوں لگے پہرے
کہ بند آنکھوں کے رستے وہ آرہا ہے کوئی

نورِ عرفان میں ادراک ڈبو کر اک دن
بے خودی لے گئی کتنوں کو خُدا ہی کی طرف

حوصلہ ہو تو کسی دن تو صبا کے ساتھ چل
وہ تجھے بھی دُور تیری ذات سے لے جائے گا

ٹپکا لہو جو آنکھ سے دِل میں خلش ہوئی
لوح و قلم کی ہم سے بہت پرورش ہوئی
وہ ایک شخص جس کی نظر بھی دماغ تھی
سب پوچھتے ہیں اس کی کہاں پرورش ہوئی
جسموں کے کاروبار میں سجنے لگی دُکاں
تلخی تھی جتنی اُتنی ہی پیدا کشش ہوئی

درو دیوار سے ٹپکے ہے جنوں کی مستی
اِک گلستاں سا ہے یہ دیدۂ تر کا منظر

جناب بلند اختر بلند عظیم آبادی صاحب کہتے ہیں۔ "علیم صبا نویدی کی شاعری ضمیر الشعراء حضرت عبدالوحید طرفہ قریشی سیمابی بھنڈاری، امینِ سخن حضرت محمد شارق جمال ناگ پوری، ڈاکٹر جاوید اشرف فیض اکبرآبادی، پروفیسر ڈاکٹر کرامت علی کرامت، کرشن چندر، وغیرہ جیسے اساتذۂ فن اور اکابرِ ادب کو بھی مسرور کرتی رہی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کہتے ہیں۔ "میراں جی اور ن۔م۔راشد کے بعد ایک بے حد اہم شاعر محمد مجید امجد ہے۔ جس کی بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ وہ علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال سیال کوٹی کے بعد سب سے توانا آواز ہے۔"

ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کہتے ہیں۔ "اِس دَور میں سب سے زیادہ نعتیں کہنے کا سہرا عبدالعزیز خالد کے سر ہے۔"

سیّد محمود ہاشمی صاحب کی نظر میں محمد علوی اِس دَور کا سب سے اچھا شاعر ہے۔ گویا ان حضرات کو کرنل فیض احمد فیض سیال کوٹی، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

علامہ جمیل مظہری، احسان بن دانش، عبدالحئی ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری محمد اختر الایمان، وغیرہ کے یہاں وہ خوبیاں نظر نہیں آتیں جو امجد، خالد، علوی وغیرہ کے یہاں دِکھائی دیتی ہیں۔

میرے خیال سے ڈاکٹر بشیر بدر کے بعد علیم صبا نویدی سب سے بلند اور توانا آواز ہے۔

جس طرح کچھ پھولوں کے سینے میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہوتی ہے اُسی طرح علیم صبا نویدی کے بعض اشعار میں دھیمی دھیمی آنچ پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے یہاں جو گہرائی اور گنجینۂ معنی کا جو طلسم موجود ہے وہ دَورِ حاضر کے بہت کم شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔

آج کا ہر نقّاد اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اپنے قد کی خود ساختہ اونچائی میں مست رہتا ہے۔ وہ کسی تحقیق یا تخلیق کی گہرائی میں اُترے بغیر اپنے (Statement) دیتا رہتا ہے۔

میرا (فیض اکبرآبادی) کا ایک شعر ہے ؎

مست ہے اپنے قد کی جو اونچائی میں
اُترا ہے وہ شخص کبھی گہرائی میں؟

ابھی تک کسی ایک نقّاد نے بھی جناب علیم صبا نویدی صاحب کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا ہے۔

آج کا ہر نقّاد (Criticizer) غالباً مطلب پرست ہے۔

لیکن انشاءاللہ وہ دَور ضرور آئے گا جو علیم صبا نویدی جیسے عظیم اور منفرد شاعر کو صحیح مقام دے گا۔

یہی ناقد کہیں گے فیض صاحب
صبا جیسا سخنور بھی ہُوا ہے

محاکاتی ادراک کا شاعر

○ ڈاکٹر مجید بیدار

مولانا آزاد کالج ، اورنگ آباد

زندگی کی ہمہ جہتی (Multi Dimensional) خصوصیات کو اجاگر کرنے میں دنیا کا ادب پورے ادبی ضروریات کے ساتھ جدوجہد میں لگا ہوا ہے اور ہر زبان کے ادیب و شاعر اسی جستجو میں سرگرداں ہیں کہ اُن کی تخلیقات کے ذریعہ زندگی کی بھرپور نمائندگی ہو جائے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ ہر چہرے پر مصلحت کے کئی پردے پڑے ہوئے ہیں اور انسانی رویے موقع پرستی کا شکار ہیں۔ فن کاروں کے لئے یہ دشوار گذار مرحلہ ہے کہ تخلیق کو کس زاویے سے پیش کیا جائے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہندوستانی ادبیات میں خاص طور پر اردو ادب کے پرستاروں نے اظہار کے وہ رویے ڈھونڈ نکالے جن سے دورِ حاضر کی زندگی اور انسان کی ذہنی، نفسیاتی اور معاشی کشمکش کو نمایاں کیا جاسکے اردو شاعری میں جدید غزل تمام انسانی، کائناتی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے اظہار میں کامیاب ہے۔ غزل گو شعراء نے نئی لفظیات، پیکریت اور محاکاتی عوامل کے ذریعے زندگی اور انسانی رویوں کے راز افشاء کرنے کا سلیقہ حاصل کر لیا ہے ایسے ہی ایک سلیقہ شعار اور جدید لفظیات کے معمار شاعر کا نام علیم صبا نویدی ہے جو نہ صرف غزل کی زبان کو حسنِ پیکروں سے وابستہ کرتے ہیں بلکہ پیکریت کے ذریعے غزل کی شاعری میں سوچ کے دھارو کے لئے ماحول پیدا کر دیتے اور محاکاتی صلاحیت کی بدولت اپنے ہمعصر شعراء میں انفرادیت حاصل کر لیتے ہیں۔ علیم صبا نویدی مدراس کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے کئی

شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی غزلوں کا تازہ مجموعہ "اثرِ خامہ" شائع ہوا ہے جسمیں بیشتر غزلیں "غزل مسلسل" کی نمائندگی کرتی ہیں جس میں نئے آہنگ کے ساتھ ساتھ اظہار کا بیساختہ پن قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔
علیم صبا نویدی کو لفظوں کے برتنے میں خاص کمال حاصل ہے۔ رواں اور دل کو چھولینے والی لفظیات کے ذریعے وہ اپنی غزل کا آئینہ خانہ سجاتے ہیں اور لفظوں کے ذریعہ ایسے پیکر تراشتے ہیں کہ مناظر کی ایک دنیا نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ مناظر کی البیلی اور بے مثل پیشکشی کو ہی محاکاتی ادراک کا نام دیا جائے گا اور اس مرحلہ میں علیم صبا نویدی کا بانکپن ملاحظہ فرمائیے۔

وہ روشنی کی یہاں مرمریں پھوار کہاں — ہمارے گھر کے اندھیروں کے بھیگ جائے بدن

★

وہ جارہاہے سسکتی شبوں کا بھاگ لیے — اذیتوں کی ہتھیلی پہ کالا ناگ لیے

★

بڑا لطیف سا اظہار ہے مرے اندر — ٹپک رہا ہے مری انگلیوں سے آہستہ
نہ جانے کون سا مینار ہے مرے اندر — ہر ایک سوچ کی کھڑکی سے پھوٹتی ہے کرن

★

ذہن لکھتا جارہا تھا، انگلیاں خاموش تھیں — چاہ کے سرسبز پتوں پر مرادوں کے حروف
گھر کے اندر آرزو کی دیویاں خاموش تھیں — گھر کے باہر نت نئے رنگوں کی لذت کا تھا شور

★

علیم صبا نویدی کی ہر غزل میں کئی اشعار مناظر، محاکات اور الفاظ کے نئے دروبست کو لیے ہوئے قاری کے ذہن کو مسحور کر لیتے ہیں۔ "اثرِ خامہ" کی غزلوں میں یہ التزام دکھائی دیتا ہے کہ علیم صبا نویدی نے ہر غزل کو شعوری طور پر

تر و تازہ بنانے کی کوشش کی ہے اور ہر غزل سے پھوٹتا ہوا ترنم شعر کی نغمگی کو دوبالا کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ علیم صبا نویدی نے غزل کو "غزل کی ہیئت" میں رکھتے ہوئے بھی شعور اور خیال کی رو سے اس قدر جانبداری برتی ہے کہ ان کی غزلیں حسرت موہانی کی غزلوں کی طرح مسلسل خیال کی آئینہ دار بن جاتی ہیں لیکن فرق یہی ہے کہ حسرت موہانی کا جذبہ "محبت" اور خیال "محبوب" ہے جبکہ علیم صبا نویدی کی غزلوں میں جذبے اور خیال پر جدید لب و لہجہ کے علاوہ مناظر کی حکمرانی ہے جو بلاشبہ دورِ حاضر کی دین ہے۔

علیم صبا نویدی کی غزلوں میں محاکاتی کشش کا تعلق منظر نگاری کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ وہ محاکاتی ادراک کو فلسفیانہ اساس سے ہم آہنگ کرتے اور بڑے ہی دلچسپ انداز میں اپنے خیال اور تصور کو لفظوں کے پیچ و خم سے آراستہ کرتے ہیں۔ ان کی ایک ہی غزل میں فلسفیانہ محاکات کا اثر ملاحظہ ہو ؎

جو سماں باہر ہے میرے وہ سماں اندر نہیں
لامکاں باہر ہوں لیکن لامکاں اندر نہیں

میں یہ کہتا ہوں کہ سات عالم کا ہے مجھ میں ظہور
تو یہ کہتا ہے کہ کوئی آسماں اندر نہیں

دھڑکنوں کے آئینوں میں عکس میرا منکشف
اپنے اندر سے ہی پوچھو میں کہاں اندر نہیں

جمالیاتی احساس کے بجائے صوفیانہ احساس کی جس رو کو علیم صبا نویدی نے اپنی اس غزل میں شامل کیا ہے اس میں بے باکی کے علاوہ حقیقت کا عکس ضرور دکھائی دیتا ہے لیکن خود فراموشی کا اظہار کہیں بھی نہیں بلکہ وہ بڑے لطف کے ساتھ اپنے دروں و بیروں بینی شخصیت کو واضح کر دیتے ہیں ؎

خود کو آئینہ بنا کر عکس میرا دیکھ لے
صاف آئینہ ہے دل، نقشِ گماں اندر نہیں

ظاہر و باطن مرا ہے صاف اور شفاف جھیل
میں فقیرِ بے سر و سامان نہاں اندر نہیں

ذات کا کرب اور شخصیت کی کئی پرتوں کا ذکر دورِ حاضر کی شاعری کا وصف ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے بیشتر شعرا نے اپنی ذات کو کئی پردوں میں نہاں رکھنے کی کوشش کی جبکہ علیم صبا نویدی نے اپنی ذات کے اظہار کے علاوہ ظاہر و باطن ایک ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ علیم صبا نویدی کے اندرونی کرب کی شدت بھی محاکاتی خصوصیات سے مالامال ہے۔ وہ جس کمیابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے احساس کی گرمی ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

پیڑ بیوہ ہوگئے ہیں، پتیاں سب اُڑ گئیں
مسکراتے موسموں کی دھجیاں سب اڑ گئیں

دفن جب سے ہوگئی ہیں عظمتیں پہچان کی
چاہتیں ہیں خشک رشتہ داریاں سب اڑ گئیں

نفرتوں کی آنچ چھونے لگ گئی ہے آسماں
جب سے دل کے ہاتھ سے ہمدردیاں سب اڑ گئیں

★

اُلجھنوں کی سرد لُو میں چاہتیں سنولا گئیں
ٹہنیاں تھیں سونی سونی رنگتیں سنولا گئیں

ہر بدن تھا زخم خوردہ اور اذیت ناک سانس
کیا عجب رُت تھی کہ ہر سو صورتیں سنولا گئیں

چوکھٹوں پر نام کے طغرے لگے تھے ہر طرف
گھر کے اندر کی مگر سب عزتیں سنولا گئیں

ایک حساس فنکار ہونے کے ناطے علیم صبا نویدی نے اپنی مسلسل غزلوں میں جدید تشبیہات اور لفظیات کے ذریعے دورِ حاضر کی حقیقتوں کو بے کم و کاست بیان کردیا ہے اس مرحلہ میں بھی وہ بیامیری یا پھر قنوطی طرز و انداز سے کام نہیں لیتے بلکہ محاکاتی احساس کو اجاگر کرتے ہیں۔ البتہ ان کے اظہار میں افسردگی کا عکس ابھر جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کلام میں ضرور جان پڑ جاتی ہے۔ ایک ایشیائی باشندے اور مشرقی تہذیب کے علمبردار کو بلاشبہ ایسے مرحلہ میں افسردہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ علیم صبا نویدی نے " اثرِ خامہ " کی شاعری میں عزم و استقلال کی نمائندگی بھی کی ہے لیکن اس قسم کے اظہار میں علیم صبا نویدی کے لہجہ کی پستی نمایاں ہوجاتی ہے۔ ؎

میں جب بھی اپنے مقدر سے جاگ اٹھوں گا — نئے صدف، نئے گوہر سے جاگ اٹھوں گا
جلوسِ نورِ سماوات لے کے آنکھوں میں — میں ہر بجھے ہوئے منظر سے جاگ اٹھوں گا

ان اشعار میں علیم صبا نویدی کے عزم و استقلال پر انانیت کی چھاپ اس قدر شدید ہے کہ بیساختگی کے باوجود وہ اپنی ذات اور شخصیت سے عشق کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی مزید ایک غزل کے اشعار پیش ہیں ؎

بدن میں ہوں، بدن سے دور ہوں میں — نصیب آور فضا کا نور ہوں میں
تنزّل سے مرا کیا واسطہ ہے — ترقی یافتہ بھرپور ہوں میں
ہر اک آہٹ مری گردوں شکن ہے — مجھے پڑھو تو نیا دستور ہوں میں

فخر اور انانیت کا فرق بھی ان کی غزلوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث طلب مسئلہ ہے کہ شاعر کو کس حد تک فخر کرنا جائز ہے اور کس حد تک انانیت کی اجازت دی جا سکتی ہے تاہم علیم صبا نویدی کے کلام میں اس جذبے کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ؎

میرا اندر ہے مختلف سب سے — میں زمیں پر ہوں اک نئے ڈھب سے

★

جب سے ہوئی ہیں میری نگاہیں دراز قد — میرا ہر اک خیال فلک پوش ہو گیا

★

میں اندھیرا تھا تو پسِ منظر میں پھر — ضوفشاں، اندر یہ منظر کون تھا

★

مرا فن آسمانی ہو گیا ہے — کہ اسرارِ جہانی ہو گیا ہے
مرا پہلا قدم اٹھنے سے پہلے — جدا پانی سے پانی ہو گیا ہے

مستقبل کا نقاد ہی فیصلہ کرے گا کہ علیم صبا نویدی نے ایسے اشعار کے ذریعے کس کیفیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا فخریہ انداز بھی دوسرے شاعروں سے جداگانہ ہی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں ؎

شہرِ اظہارِ غزل میں اب علیم مجھ سے افضل اور بہتر کون تھا

اس شعر میں ردیف کی ضرورت کے لحاظ سے "تھا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ حقیقی طور پر "موزونیت" کی خاطر "ہے" کا استعمال کیا جانا چاہیئے۔
چند اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

زوالِ فن کی سیاہ کاریاں مٹانے کو صبا کے لب سے تحرکتی تجلیاں نکلیں

*

دیکھنا یہ ہے مرے بعد نئی سوچوں کا کتنے ذہنوں سے نیا شعلہ یہاں اُٹھتا ہے

*

کسی نے مجھ سے مرا نام تک نہیں پوچھا سنا چکا ہوں کئی شعر ان کہے اب تک

غرض علیم صبا نویدی نے "اثرِ خامہ" کی غزلوں میں مرزا غالب سے زیادہ اپنے کلام پر فخر کیا ہے۔ جسے جائز یا ناجائز قرار دینے کا فیصلہ مُفتیانِ ادب کریں گے جبکہ "اکتسابِ نظر" کے خالق راہی فدائی کا یہ استدلال ہے۔

" اردو کے نامی گرامی اولیاء میں ولیٔ کامل، شیخِ طریقت اردو جناب علیم صبا نویدی ہیں..... بہر حال جناب علیم صبا نویدی کی "ولایت" میں برصغیر ہند وپاک بلکہ عالم اردو کے کسی بھی نقاد کو کلام نہیں..... آپ کے شاعرانہ کمال پر ایمان لانا مومنِ اردو کے لئے لازمی ہے اور اس کا انکار کفرانِ نعمتِ اردو متصور ہوگا۔"

ان جملوں میں حقیقت پسندی کم اور مبالغہ آرائی زیادہ نظر آتی ہے ۔ علیم صبا نویدی کی شاعری میں موجود دوسرے اوصاف کے ذکر کے ساتھ اُن کے تصورِ زندگی اور تصورِ غم سے بحث بھی لازمی ہے علیم صبا نویدی نے تصورِ ذات اور کائنات کے ذریعے جن خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علیم صبا نویدی کی غزل گوئی میں اتنی جامعیت ہے کہ ہر موضوع پر علاحدہ مضمون لکھا جائے۔ ایک مختصر سے مضمون میں ہر عمل کا احاطہ مشکل ہے۔ تاہم اُن کے خیالات کی روح کو موضوعات کے ذریعے نمایاں کرنے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔

"اشرخامہ" کی غزلوں میں "غم" کا واضح تصور پایا جاتا ہے ان کے غزلوں میں چھائی ہوئی افسردگی خود غم انگیز لمحات کی غماز ہے۔ لہجہ کا دھیماپن اور اس میں موجود ملاحت خود پتہ دیتی ہے کہ علیم صبا نویدی جس غم کے پروردہ ہیں اس کی گہرائی تک پہنچنا مشکل نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ وہ غم کی کائنات اٹھائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ "غم پسندی" سے انھیں بے انتہا انسیت ہے۔ چنانچہ ایک غزل کے اشعار میں پوشیدہ غم کی جھلک ملاحظہ ہو ے

یہ مری راہ گذر پر غبار سا کیوں ہے ۔۔۔ اُداسیوں میں پگھلتا دیار سا کیوں ہے
بہت سی اور چٹانیں ہیں سربلندیاں ۔۔۔ مرے ہی سر پہ یہ گردوں سوار سا کیوں ہے
وصال تیرا، وصالِ زمرّدیں ہے مگر ۔۔۔ ہمارے حق میں یہی کوہسار سا کیوں ہے

★

جب سے پہن لیا ہے غموں نے نیا لباس ۔۔۔ ملبوس چاہتوں کے بہت میلے پڑ گئے
میرے بدن میں زہرِ تبسم کا گھول کر ۔۔۔ وہ کون تھے جو مجھ سے اچانک بچھڑ گئے

★

لطیف احساسات کے اظہار کے معاملہ میں بھی علیم صبا نویدی نئے نئے

محاورے، نئی تشبیہات اور نئے انداز سے لفظیات کی ایک نئی دنیا بساتے ہیں۔ علیم صبا نویدی کے جدید محاورے منفرد تشبیہات اور اچھوتی لفظیات خود ایک بھرپور مضمون کا تقاضہ رکھتی ہے۔ "اخرِ خامہ" میں ہر شعر جدید لب ولہجہ کی تمام ضوفشانی لئے ہوئے ہے۔ ان کا اچھوتا خیال اور خیال کے لئے استعمال کئے جانے والے لفظ وترکیب کی انفرادیت ملاحظہ ہو ے

ٹپک رہا ہے مری انگلیوں سے آہستہ ۔۔۔ بڑا لطیف سا اظہار ہے مرے اندر
ہر ایک سوچ کی کھڑکی سے پھوٹتی ہے کرن ۔۔۔ نہ جانے کون سا مینار ہے مرے اندر

★

ہمارے گھر کے اندھیروں کے بھیگ جائے بدن ۔۔۔ وہ روشنی کی یہاں مرمریں پھوار کہاں
پتہ نہیں کہ تری یاد کے جلوس تمام ۔۔۔ اڑا کے لے گئے ماضی کے شہ سوار کہاں

علیم صبا نویدی، سادہ اور دلچسپ لہجے کے شاعر ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں پیچیدہ اور پرکار تراکیب کا کہیں بھی گذر نہیں۔ سہل ممتنع کے انداز میں وہ لفظوں کی دیواروں پر خیال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں جس میں نئے آہنگ کی چھت اور رواں بحروں کی سجاوٹ، شاعری کی عمارت کو حد درجہ حسین اور دلکش بنا دیتی ہے۔ لیکن علیم صبا نویدی کے خیال پر عمارت سازی کی حکمرانی نہیں بلکہ وہ اپنے دور پر طنز کرتے اور شاعری کے ذریعے اپنے عہد کا مذاق بھی اڑاتے ہیں ے

آج ہر گھر کی فضا میں جلوہ گر ۔۔۔ منظرِ فردوس ہے شدّاد کا

★

شاخ اچھائیوں کی سوکھ گئی ۔۔۔ اس چمن میں ہرا بھرا کیا ہے

★

یونہی ڈرتے رہو گے تو یہ دنیا ۔۔۔ سزا پر اور سزا بھرپور دے گی

سبز قصّہ لوگ اپنی رات کاٹتے رہے　　جھوٹ کے منڈ دے تلے سچ کو بُرا کہتے رہے

★

ہر موڑ پر ہے مجلسی چہروں کا انبساط　　ظاہر کو چھوڑ کر کبھی اندر بھی دیکھنا

علیم صبا نویدی کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تجربات اور مشاہدات کی بھٹی میں پکے ہیں اسی لئے اُن کے تخیّل میں کندن بننے کی صلاحیت اور اپنی چمک دمک دکھانے کی خصوصیت موجود ہے۔ ان کا کوئی خیال نہ تو ادھورا ہے اور نہ ہی ان کی فکر میں کسی قسم کی کجی ہے اسی لئے ان کے کلام میں تر و تازگی کے ساتھ ساتھ بلند پروازی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علیم صبا نویدی کی شاعری معیاری اور اپنی جگہ آپ بنانے والی شاعری ہے جو دلوں میں جگہ بنانے کے علاوہ اپنا اثر چھوڑنے کی تاثیر رکھتی ہے۔ علیم صبا نویدی برسہابرس سے لکھ رہے ہیں اور ان کے کلام کی جامعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ ان کے شعری محاسن اور ان کے کلام کی خصوصیات کو عوام کے سامنے رکھا جائے کیونکہ ہر اچھے شاعر کا کلام ایک بہتر نقاد کے ذریعے ہی ادبی اور فنی لوازمات کو اجاگر کر سکتا ہے۔ غرض "اثرِ خامہ" کے ذریعے علیم صبا نویدی نے اردو غزل کو نئے لفظ و آہنگ کی دنیا کی سیر کرائی ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں اسی آہنگ اور لہجہ کو اختیار کرنا باعثِ افتخار سمجھیں گی۔ غزل کی شاعری میں علیم صبا نویدی نے ایسی شناخت قائم کرلی ہے کہ جس کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہے گا اور نئے دور کی ادبی تاریخ میں ان کا نام اور کلام منفرد خصوصیات کی بناء پر یادگار کی حیثیت حاصل کرے گا۔ ———●

نئے لہجے کا شاعر

○ ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی

علیم صبا نویدی عصر حاضر کے ان پرجوش جواں شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جو اردو نظم و غزل کو ایک نیا لہجہ دینے میں کوشاں ہیں ان کی تخلیقات میں ذاتی تجربات کا کافی دخل ہے۔ محسوسات کا رنگ اگرچہ نمایاں ہے مگر ان سے معقولاتی اسرار و رموز تک رسائی ہوتی ہے آپ کے پاس علمی و ثقافتی سرمایہ کے علاوہ ماحول و حیات اور کائنات سے اکتساب کردہ ہنر بھی موجود ہے جس سے اُن کا انفرادی کردار روشن ہوتا ہے۔ بعض اشعار میں غزل کی دیرینہ رمزیت بھی ہے مگر اس میں نئے ذہنی رویہ کا عکس ایک تازہ مانوس لہجے میں جھلک رہا ہے۔

زیر نظر مجموعۂ کلام "اثر خامہ" آپ کی بیس سالہ ادبی کاوش کا نتیجہ ہے اس قدر طویل عرصۂ حیات میں زندگی کے نشیب و فراز تقریبا پوری طرح نمایاں ہوسکتے ہیں لہٰذا صبا نویدی کے اس مجموعۂ کلام میں انسان، سیاست اور کائنات کے حدود آپس میں ملے جلے نظر آرہے ہیں انسانی صفات کی جلوہ گری کے علاوہ ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے حیات کی پُر اسرار رنگینیوں کے ساتھ کائنات کا طلسماتی مشاہدہ بھی نمایاں ہوجاتا ہے ان تمام چیزوں کی تلاش و جستجو کا کمال "اثر خامہ" میں رواں دواں ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو غزل میں عشق و محبت کی مرکزیت سے گریز و انکار کا سہرا غالب کے سر بندھا ہوا ہے جس نے اس قدیم روایت

کا لبادہ اپنے کلام سے اتار کر اس میں معنویت کی گیرائی و گہرائی کی دھنک پیدا کر دی۔ رفتار زمانہ کے ساتھ اس صنف میں زندگی کے مختلف مسائل داخل ہو گئے اور غزل کا موضوع آدابِ عشق کے بجائے آدابِ زندگی بن گیا "اثرِ خامہ" کے وسیع میدان میں زندگی کے بے شمار رشتوں اور ناطوں کے روپ جلوہ گر ہیں چنانچہ علیم صبا نویدی فرماتے ہیں۔

میں دے رہا ہوں ادب کو شعور نو کا لہو
نئے شعور کا دربار ہے مرے اندر

سیاسی الٹ پھیر کی بوقلمونی، مختلف نظریات کی قوسِ قزح، نئی نئی ذہنیتوں کا اُتار چڑھاؤ علیم کے ذہن و قلم کو قوت بخش رہے ہیں جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

ورق ورق نے مرے ہاتھ میں قلم سونپا
غزل کے شہر میں جب بے زباں ہوا تھا میں

الفاظ کی سادگی، معانی کی جدت، جذبات کی رفعت، طریقۂ اظہار میں ندرت "اثرِ خامہ" کی عکاس معلوم ہوتی ہے۔ عام واقعات میں احساسات کے سنجیدہ انکسار میں حیاتِ آفریں شعور کی بجلی کو ندرہی ہے جس سے غزل کی وجدانی کیفیت میں جان پڑ گئی ہے داخلیت اور خارجیت کی سرحدوں کو ایسا ملا دیا ہے کہ ہر شعر حیات و کائنات کا آئینہ دکھائی دیتا ہے۔

احساس کی سڑک پہ کڑی دھوپ دیکھ کر
مدّت کے بعد قرب کا بادل برس گیا

اب روشنی کے لب پہ خموشی محیط ہے
زہریلا ناگ جیسے تبسّم کو ڈس گیا

کیوں لوگ چوسنے لگے لفظوں کی انگلیاں
تحریر اس کے ہاتھ کی کیا میٹھی ہو گئی

زوالِ فن کی سیہ کاریاں مٹانے کو
صبا کے لب سے تھرکتی تجلیاں نکلیں

ورق ورق پہ اچانک بکھر گیا ہے آج
مرا شعور ہمیشہ جو میرے اندر تھا

وہ بات جس کا نہیں ہے وجود ذہنوں میں
صبا نویدی وہی بات کرنے والا ہے

صبا نویدی کی شاعری ملک کے تہذیبی وسماجی عوامل کی علمبردار معلوم ہوتی ہے۔ صبا کی غیر معمولی فنی بصیرت میں ادبی دیانتداری، واقعات کی صورت گری، عصری معائب و اسقام کا تجزیہ جا بجا ملتا ہے اور صبا کے ہاں عصری افکار و مسائل کے درد و کرب کی تڑپ بھی موجود ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت، معاشی استحصال، نیم فوجی تنگ نظری فرقہ وارانہ ولسانی عصبیت کے زہریلے چشمے بھی اُبلتے دکھائی دیتے ہیں.

چاہتوں کے سبز پتے ٹہنیوں سے کیا گرے
موسموں کے ساتھ تیرے گھر کا اُجلا پن گیا

کرنے کو جگمگاتے ہوئے شہر کا طواف
رسوائی گھر سے کود کے گلیوں میں آگئی

سانسوں میں آگ لب پر دھواں رخ پہ دھند ہے
تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی !

ڈالی گئی تھی جو مرے جذبوں کے پاؤں میں
رفتارِ وقت نے وہی زنجیر کھینچ لی

وہاں کے لوگوں کی خوراک ہے ہمارا گوشت
ہمارے پاؤں کے نیچے جو ایک دھرتی ہے

جن رُتوں پر قتل کا الزام تھا

وہ رُتیں بھی اب سروری ہوگئیں

صبا نویدی اپنے کلام سے ہمارے ادراک کی تربیت کرتے ہیں ہمارے نقطۂ نظر میں تازگی بخشتے ہوئے عمومی واقعات میں ایک عبرتی لچک پیدا کرتے ہیں خدا کرے کہ آپ کی افادی شاعری جیتی جاگتی رہے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ ایک حقیقی کارنامہ ذاتی، عصری اور آفاقی ہوتا ہے جس سے ادیب کی ذات وصفات' اسکے زمانے کی سیاسی۔ سماجی۔ اور نفسیاتی تصویر انسانی حیات و کائنات سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے علیم اپنے ادبی کارنامہ کو دلکش دیرپا اور موثر بنانے میں ہر دم کوشاں ہیں افادیت کا یہی پہلو غیر محسوس طور پر ادراک کی تربیت کرتاہے "اثر خامہ" میں حسن وحقیقت کے جو ترسیلی رموز ہیں وہ ان کے کلام میں ایک تازہ سماں باندھ دیتے ہیں

ظاہر یہ ہے میری حکومت اپنے اندر نوکر سا ہوں

اب دھوپ اپنے شہر کی یوں پیلی ہوگئی پی پی کے جس کو ساری فضا کڑوی ہوگئی

یہ اشعار شاعر کی ذات۔ معاش اور اسکے شہری فضا کی غماز ہیں۔ یہ عصری مصائب اور اسقام سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ کبھی کھل کر وار کرتے ہیں تو کبھی طنز کے تیر برساتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسانی چہرہ کا ظاہری خول اتار کر اسکے باطنی منصوبہ بندیوں کے پرخچے اڑا دیتے ہیں زندگی کے جھمیلے شاعر کے ہاتھ میں الجھے ہوئے دھاگے کی طرح دکھائی دے رہے ہیں جسمیں خود الجھنے کے بجائے شاعر سلجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے اصطلاحی پہلو پر طنزیہ رنگ غالب ہے اوپر دی ہوئی مثالوں میں اسی کیفیت کی ایک جھلک نمایاں ہے پرانے الفاظ کے سہارے فرسودہ نفسیات وحالات کو زندہ شستہ اور نوخیز بنا دیتے ہیں جس سے کلام

میں رمزیت پیدا ہو جاتی ہے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صبا کا کلام اپنے زمانے کی روح سے ہم آہنگ تا ہے چنانچہ فرماتے ہیں

پیڑ بیوہ ہو گئے ہیں، پتیاں سب اڑ گئیں — مسکراتے موسموں کی دھجیاں سب اڑ گئیں
دفن جب سے ہو گئی ہیں عظمتیں پہچان کی — چاہتیں ہیں خشک، رشتہ داریاں سب اڑ گئیں
اس گھر کی بیوگی کو بھلا کون دے سہاگ — جس گھر کا باوقار تبسم شہید تھا
منظروں کی آنکھ نم تھی اور فضا تھی زرد رنگ — قتل گاہوں میں جہاں سچائیاں خاموش تھیں
کیا دیکھتے دماغی اجالوں کا ارتقاء — وحشت کی بھیڑ دشت سے شہروں میں آ گئی
شکستہ نبض، چکیدہ لہو، فسردہ سانس — کوئی نکالے مجھے ان قیود سے باہر

صبا اپنے کلام میں تکرار لفظ سے جان بھر دیتے ہیں جس سے خارجی و داخلی حسن واضح ہو جاتا ہے قاری کے دل سے شاعر کا تعلق براہ راست ہو جاتا ہے اسی تکرار سے معنی تہ در تہ ہو کر گہرا ہو جاتا ہے لفظی و معنوی حسن و جاذبیت کی صورت ذیل کے شعری آئینہ میں آشکار ہے۔ ہے

گھر کے باہر قبرستان — گھر کے اندر تنہائی
افق افق ہے صبا نویدی — پست ہے لیکن اپنے قدمیں
سینۂ فکر داغ داغ لگا — آرزوؤں کا خشک باغ لگا
انگلیوں سے اتر کے آہستہ — آج سر سے مرے دماغ لگا
سمندر سمندر صدف در صدف — میں قطرہ تھا لیکن گہر دار تھا
سانس در سانس لو ہو نورانی — اپنے اندر وہ سبز باغ لگا۔
گلی گلی میری دیوانگی ہوئی مشہور — ورق ورق میرے خوابوں کا داغ جاگا ہے
لہو لہو ہوا جب سے یہ آسمانی سفر — نظر میں رشتۂ فکر سراغ جاگا ہے
بوٹا بوٹا جوہر میرا — پتا پتا گوہر سا ہوں

چہرہ چہرہ اُلجھنوں کا ہم سفر　　　سینہ سینہ درد کا انبار ہے

اس سہل اور سادہ الفاظ کی تکرار میں روز مرّہ اور محاورہ بندی کی دیدہ ریزی بھی ہے اور اصلاح و طنز کی معنوی اجاگری بھی، ماحول کی داخلی شہادتیں بھی اور نفسانی و سیاسی عوامل بھی۔ جزئیات بھی۔ غور و خوض بھی ہے اور کلیات کی نشاندہی بھی۔

چند حقائق کو واضح کرتے ہوئے تعلی کے ورطہ میں شاعر کبھی کبھی پھنس جاتا ہے۔

میرا رشتہ ان سے رشتہ　　　میں ہی میں ہوں ازل ابد میں

وہ یقیناً سرِ تاریخ بنا لے گی مقام　　　فن کے مکتب سے مہک کر جو صبا آتی ہے

تلاشِ مسلسل صبا ہے عبث　　　نہیں مجھ سا بہتر سخنور یہاں

صبا کے کلام میں بلاغت کے اصول پر علم بیان و بدیع کے لفظی و معنوی محاسن بھی پائے جاتے ہیں۔ طباق تحسین۔ لف و نشر، کنایہ اور استعارات کا استعمال بھی جاذب نظر ہے صبا کی اس غیر معمولی فنی بصیرت میں ادبی دیانتداری اور ذہن نوازی کا پتہ چلتا ہے۔ صبا کے یہاں تخیل کی فراوانی ہے تخیّل کے کیمیاوی عمل میں واقعات کی صورت گری، کردار کا تجزیہ اور جذبات کی نئی تنظیم بھی پائی جاتی ہے۔ صبا موجودہ دور کی سنگین فضا میں کھو جاتے ہیں۔

انھیں سماج کی تحریکوں میں انحطاط پذیر سستم نظر آتا ہے۔ آزادی کے شور میں انقلابی نعروں میں جمہوریت کی پکار اور مساوات کے چراغوں میں انسانیت کے خون اور دُھواں دھار یں ملتی ہیں ملک کی فرقہ وارانہ اور لسانی عصبیت کے زہریلے چشمے سے انکے کلام منعکس ہیں۔ صبا نے عصر حاضر کے افکار و مسائل کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی شخصیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ردیف و قافیہ کی زنجیر میں احساسات و تاثرات کا حسین ترنم پیدا کرتے ہیں۔ صبا نے اپنے کلام میں علامات و اشارات اور پیکر نگاری کے جدید عناصر کو داخل کر کے حقائق کی رنگینی پیدا کر دی ہے۔ صبا کے کلام میں ایک گونہ شادابی نظر آتی ہے جسکی وضاحت و بے ساختگی اور شیرینی سے عام انسان بھی

متاثر ہو جاتے ہیں۔ صبا نے سماج کے ان تلخ حقائق میں بصیرت و تہہ داری کی جاذبیت سمو دی ہے۔ مثلاً

بجھتی تنہائی کے پیکر کو سجانے کیلئے   چاند تاروں کے کبھی نور کا زیور نہ اتار

آج بھی گھومتی رہتی ہے سہاگن کی طرح   کوئی قوت مری ناکردہ گناہی کی طرف

صبا نویدی کے کلام میں گھن گرج چیخ و پکار یا نعرۂ انقلاب کا شور نہیں ہے یہ یاس و امید، اندھیرا، اجالا، نیکی بدی، انسانیت و حیوانیت کی کشمکش کا جادو جگاتے ہیں یہی ان کی شاعری کا وسیلۂ اظہار ہے جو موہوب الالٰہی سے کم نہیں۔

صبا کی خصوصیت اُن کے ذہن کی زرخیزی اور ان کی پُرگوئی ہے توکل عزلت نشینی کے ساتھ ساتھ صبا نے اپنے کلام سے بے جان چیزوں میں قوتِ گویائی پیدا کر دی ہے۔ طرزِ فکر کے اعتبار سے غزل کا سانچہ خود وضع کر لیتے ہیں۔ یہی ان کے لہجے کا تنوع ہے آخر میں صبا نویدی کے ہی ایک شعر پر اپنی بات ختم کرنا پسند کروں گا۔

لب کیا کھُلے کہ قوتِ گویائی چھن گئی
پیشِ نگاہ وہ تھے کہ بینائی چھن گئی

ناقدینِ علیم صبا نویدی ـــ ایک تاثر

○ ڈاکٹر غیاث اقبال

تملناڈو کی دُھند آلود ادبی فضاؤں میں مثلِ آفتاب فروزاں ہونے والا فن کار صبا نویدی ہے۔ جس نے ہر طرح کے احساس زیاں سے اوپر اٹھ کر خود اعتمادی کے ساتھ عالمِ خود فراموشی سے منسلک ہوتے اور سوتے جاگتے اس عالم سے ہویدا ہونے والے کو ندوں کو خوش آمدید کہا ہے اور خود کو مرتکز کرنے کی بارہا سعی بلند کرتے ہوئے اپنی وہبی سوچ، متصوفانہ فکر نیز وجدانی قوت کے زور سے کائنات اور زندگی کو ایک نہایت وسیع تناظر میں دیکھنے کی سبیلیں اپنائی ہیں۔ اپنے احساساتی و وجدانی تجربات کو ادبی و شعری تجربات کو ادبی و شعری تجربات کا روپ دیتے ہوئے صبا نویدی نے ایک فعال و متحرک تخلیقی ذہن کے مالک ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ادب کے اس تخلیقی عمل کو مختلف دانشوروں نے مختلف النوع کسوٹیوں اور معیاروں سے مَس کرنے اور نویدی کے خلق کردہ فن پاروں کے اعماق میں متمکن اُن تخلیقی سوتوں تک پہنچنے کی جو سعی کی ہے ایک طرح کے تخلیق مکرّر کے ذائقے سے لیس ہے جو بے حد مُستحسن ہے۔

ڈاکٹر نجم الہُدیٰ (مرتب "آسمان فن کا سفیر") نے حرفِ آغاز میں نویدی کے ادبی انہماک پر جب رشک کا اظہار فرماتے ہیں تو ہمارے اندر بھی رشک کا یہی احساس جنم لیتا ہے کہ نویدی غیر ادبی ملازمت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ادب کے وسیع بھنڈار سے اتنی ساری سعادتِ کثیر آخر کیسے کشید کرتا ہے ہو نہ ہو یہ اُس کے فعال

اور متحرک تخلیقی ذہن کا کارنامہ ہے اور یہ سعادت خالقِ کائنات کی عطا کردہ ہے۔ محترم نجم الہدیٰ نے نویدی کی ھندی الاصل افعال کو ردیف بنانے کی سرشت کا ذکر فرماتے ہوئے جن شعروں کا انتخاب فرمایا ہے ان سے محفوظ ہوتے ہوئے مجھے یہ تین شعر پسند آئے جو صبا کے فن کے مزاج سے قریب ہونے میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔ ؎

پاس ندی کے سوکھا شجر اک ملا　　قابلِ دید تھا، دیدہ ور اک ملا

اپنے اندر میں بہت خوش تھا مگر　　میرے ہونٹوں پر ہنسی لکھی نہ تھی

زمیں کیا فلک سے بھی اونچا گیا　　مرا قد اڑانوں سے ناپا گیا

مذکورہ بالا اشعار کی قرأت سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اولاً نویدی روایت کو اپنے تخیل اور اس کی بصیرتوں کا ایک جُزو لاینفک تصور کرتا ہے ثانیاً ان ادبی روایتوں سے پھوٹنے والی روشنی کو بے حد محترم و مخلص انداز میں جذب کر کے دیدہ کو نورِ دیدہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور نتیجتاً خاک کو افلاک کی جھلک دکھانے اور موجود کو ماورا سے ہم آہنگ کرنے کا خواب اور اس کی تعبیر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا آرزومند ہے۔

پروفیسر نجم الہدیٰ نے نویدی کی شاعری میں چھپی ہوئی "عدم تسکین کو" جنسی نا آسودگی اور پہلی ازدواجی زندگی کی دوام بخش تلخی کا رہین" گردانتے ہیں (پروفیسر گیان چند اور محترم راز امتیاز نے بھی اپنے سابقہ اور حالیہ مضامین میں اس کا حوالہ دیا ہے۔)

بایں ہمہ نویدی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

صبا پر مضامین لکھے گئے

مگر اس کے دکھ پر نہ سوچا گیا

تو میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ صبا نویدی کا یہ "دکھ" "جنسی نا آسودگی" کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ یہ "دکھ" دراصل شعورِ ذات کا "دکھ" ہے۔ اور جس کو شیکسپیئر نے "پختگی" کہا ہے اور فرائڈ اس کو "آگاہی" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا بار امانت ہے جسکو اُٹھائے بغیر چارۂ کار نہیں۔ "شعورِ ذات" سے متصف ہونا ہی اصل میں انسانی حد بندیوں سے آگاہ ہونے کے مترادف ہے۔ "مختار" اور "مجبور" کا یہ ہوش یعنی کسبِ انسانی (Kasab) ہی اختیار کی علامت ہے جس میں از خود حد بندیوں کا احساس مستور ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کو اپنی صلاحیتوں کا جب عرفان ہوتا ہے تو وہ فوری طور پر اس کرب ناک صورتِ حال سے دکھی ہو جاتا ہے کہ آخر کار آدمی کو خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہے۔ چنانچہ موت کو شکست دے کر زندۂ جاوید ہونے کی خواہش تمام انسانوں کی مشترکہ خواہش ہے۔ اسراری فکر سے بہرہ مند ہونے کے بعد جس دُکھ سے صبا نویدی قریب ہوا ہے اس کے تانے بانے اس کے فن کی نیّت میں شامل ہیں۔ چنانچہ وہ جزو ہوتے ہوئے کُل سے ہم رشتہ ہونے کا آرزو مند ہے جب وہ کہتا ہے کہ

ے جسم مٹی کا ڈھیر ہے لیکن
ذات کا دائرہ منوّر ہے

ے جسم تاریکیوں کا دشت سہی
نور اور فلک ہے اندر کا

ے میں نے دیکھی جو کائناتِ دل
میرے اندر بھی آسمان نکلا

ے عجب بے خودی کا ہے منظر یہاں
ہے قطرے میں پنہاں سمندر یہاں

ے میں اپنی ذات سے باہر نکل کر
بظاہر چار سو پھیلا ہوا ہوں

ے بھرے قطرے کی وسعت دیکھ کر وہ
مقدر میں سمندر رکھ گئے تھے

تو بقول مولانا اسماعیل رفیعی صباؔ لامکانی سرحدوں کی فصیل" تک پہنچ جاتا ہے۔ جن کی سرحدوں کو چھونا ایک سلیم الطبع ہونہار اور ایک زندہ جاوید شاعر کا مقدر ہوتا ہے"۔

جناب ڈاکٹر عبد المغنی نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ تحلیل نفسی کو اگر ادب میں روا رکھا جائے تو جسمانی نا آسودگی کو ذہنی بے اطمینانی کی وجہ کہہ سکتے ہیں ظاہر ہے کہ اس نوع کی تحلیل مریضانہ کیفیات سے لیس ہے اور شاعر کو ایسی کسوٹی پر کسنا اور اس کے فن کے معیار کو جانچنا خود فن تنقید یا فن کو مریض باور کرنے کے مترادف ہوگا۔ عبد المغنی صاحب نے "تحلیل نفسی" کے کلیّہ سے صرفِ نظر فرما کر ادب پر احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے صباؔ کی شاعری کو "لفظوں کو مکمل گرفت میں لے کر نئے مفاہیم پیدا کرنے کی شاعری سے تعبیر کیا ہے"۔ جس سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے کہ صباؔ شعوری طور پر لفظوں کو بالترتیب لکھنے کا سزاوار ہے۔ یعنی وہ صنّاع زیادہ ہے اور شاعر کم۔ مثلاً پروفیسر حالی صاحب کہ یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔" وہ ایک ایسا صنّاع ہے جو بہت سے لفظوں کو اکھٹا کر کے ایک لفظ کو دوسرے سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے" جب کہ اردو تنقید میں آہنی لہجہ روا رکھنے والا نقاد پروفیسر گیان چند جین علیم صبا نویدی کو ایک ایسا جدید شاعر مانتا ہے" جن کی بات سمجھ میں

آجاتی ہے۔" خاکسار کی کمزور فہم اس بات کی متقاضی ہے کہ صبا کے مذکورہ ذیل ایک شعر سے ہی تادیر ادب کے افق پر زندہ رہ سکتا ہے۔

؎ پت جھڑ کے جب تیور جاگے
سناٹے کے پیکر چونکے

تو لامحالہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ وہ فن کے وجدانی و جمالیاتی رشتوں سے ہمکنار ہے اور اسے بحیثیتِ شاعر اور فن کار باور کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ صناع۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا تجزیہ میرے وجدان پر تو شاق گزرا ہے ہوسکتا ہے کہ دیگر نقاد جو نویدی کی شاعری کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتے اپنی رائے تبدیل ضرور کریں گے۔ دیگر ناقدین میں استاذی پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب نے مناسب تجزیہ پیش فرما کر تنقید اور صبا کے فن کا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح سید احمد اڈوکیٹ نے بھی۔

بہرکیف اتنا تو ہے کہ نویدی شاعری کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں اور نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں۔ اور اپنے بطون میں پوشیدہ اس گوہر کو پانے میں کامیاب ہوجائیں۔ جس کے حلقۂ نور میں ہم سب بھیگ جانے کے آرزومند ہیں۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ نویدی تجرباتی دور سے تنہا ہو کر خود کو منظم کریں اور ارتکاز کے معنوی تناظر میں خود کو منتشر انضمام اور انتشار کے درمیان کے ارتکاز سے وحدتِ فن کی جو کرن پھوٹے گی یہی نویدی کو موجودہ دور کا معتبر اور مستند شاعر شاعر بنائے گی۔

———•

اثرِ خامہ - ایک مطالعہ

○ عبدالمتین جامی کٹک

گذشتہ تین دہائی سے انواع اقسام کی اصناف سخن پر طبع آزما ہوتے والے منفرد لب و لہجہ کے جنوبی ہند کے شاعر علیم صبا نویدی اپنے شب و روز کی ادبی کاوشوں سے اردو کے قارئین کو مسحور کرتے آرہے ہیں۔ ان کی درجنوں تصانیف میں سے "اثرِ خامہ" سب سے اخیر میں شائع ہونے والا مجموعہ برائے غزلیات ہے۔ جس میں انہوں نے حسب عادت اسی چونکا دینے والے اسالیب کے بے تحاشہ استعمال سے فن غزل گوئی کو اپنی نوعیت کی نئی چیز دینے کی سعی کی ہے۔ علیم صبا نویدی کے موجودہ مجموعہ کلام پر اپنے خیال کا اظہار کرنے سے قبل ایک بات پر ضرور غور کرنا پڑتا ہے کہ کون سے پہلو پر قلم اٹھایا جائے۔ یوں تو ان کے کلام میں عصری حیات کا تمام شعور اپنے معاصرین کی مانند کارفرما نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختلف ہئیتی تجربات نیز آزاد غزلیں۔ سانٹ اور ہائکو نظموں کے مجموعوں کی اشاعت کے ذریعہ تینوں صنفوں کو اردو دنیا میں مقبول کرانے کی کوشش کی حتّٰی کہ اُن ہئیتوں میں نعتیہ کلام پیش کرکے اردو زبان کو پاکیزگی بخشی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے "علیم صبا نویدی جنوب میں بیٹھ کر شمال والوں کے ادبی مسلمات سے انحراف کی جرأت کر رہا ہے۔ لیکن آتنا ہے کہ مسلمات سے ٹکرانے کے لئے جس جرأت اور اس جرأت کو تقویت دینے کے لئے جس تخلیقی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب علیم صبا نویدی کے پاس موجود ہے اور اس لحاظ سے وہ مالدار فنکار ہے" ✿

✿ پیش لفظ - اثر خامہ

اس ضمن میں علیم صبانویدی کا ایک شعر جو کہ ان کے تازہ مجموعۂ کلام "اثرِ خامہ" میں شامل ہے اس کا حوالہ دینا غالباً بے جا نہ ہوگا۔

دور دلی سے رہنے والا　　　میرے منہ میں زبان کس کی ہے

گو علیم صبانویدی کو اس بات کا شکوہ نہیں ہے کہ وہ دلی سے سینکڑوں میل دور تملناڈو میں رہتے ہیں مگر ان کے اظہار خیال کا طریقۂ کار دلی والوں کی طرح ہے۔ اس بات پر غالباً ان کو اپنے مستقبل پر پورا بھروسہ ہے جیسا کہ ان کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

نئی غزل کے مجاہدوں میں　　　صبؔا نویدی ضرور ہوگا

مشہور نقاد نظام صدیقی صاحب نے لکھا تھا "آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لفظ کی موت ہوگئی ہے۔ لفظ جو کائنات تھا وہ نوکر شاہی کا بھونپو بن گیا ہے" مگر علیم صبانویدی　غیر اردو علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود بے روح الفاظ میں نئی روح پھونکنے کی سعی کی ہے۔ بطور خاص ان کے مجموعۂ کلام "اثرِ خامہ" سے یہی تاثر لیا جا سکتا ہے۔ یوں تو جدید شاعری خصوصاً اردو غزل میں گھسے پٹے الفاظ کے بہتات نے قاری کے ذہن میں بوریت کی تلخی گھول گھول کر تخلیق اور قاری کے درمیان کے فاصلے کو طویل کر دیا ہے۔

زمانۂ حال میں ادیب و شعراء کو کسی اور سیارے کا عجیب الخلقت مخلوق سمجھا جانے لگا ہے۔ ایسے میں قاری اور تخلیق کار کے مابین دوری کو کم سے کمتر کرنے کی ذمہ داری اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر بقولِ ڈاکٹر انور سدید "نئی غزل کا شاعر براہِ راست یا بلا واسطہ انداز بیان کا قائل نہیں ہے بلکہ خیالی پیکروں۔ استعاروں اور علامتوں کی مدد سے اپنے تاثر کے نقوش ابھارتا ہے۔" ۵

مگر اپنے تجربات و مشاہدات کو لفظی پیکروں میں ڈھال کر قارئین کے

---

۵ ماہنامہ شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء

سامنے پیش کرنے کا میکانکی انداز قاری کو شاعر سے قریب تر کرنے کے بجائے دور ڈھکیل دیتا ہے۔ جبکہ اردو شعر و سخن میں خصوصاً غزل گوئی جیسے فن کا طرۂ امتیاز یہی رہا ہے کہ اس کے بیشتر اشعار جو کہ آمد کے ہوتے ہیں جس میں شاعر کے دل کی دھڑکن سمائی رہتی ہے قاری کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے مگر آورد کے نتیجے میں اشعار کے مفاہیم قارئین کے سر پر سے اڑ جاتے ہیں۔ اس لئے شاعری میں خصوصاً غزلوں میں معنویت کی تلاش کے بجائے شاعر کے انداز بیان یعنی اسلوب اور لفظ اور جملوں کی ساخت، نشست و برخاست نیز در و بست پر ہی زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالنی چاہئے۔ اور اس میں ہی شاعر کی شناخت برقرار رہ سکے گی۔

علیم صبا نویدی کا مجموعہ کلام "اثر خامہ" پیش نظر ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا جدید انسان کی کچلی ہوئی روح کی چیخ سنی جاسکتی ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات اور اس سے حاصل شدہ ادراک کو پیش کرنے کا ان کا انداز بظاہر دوسروں کے انداز بیان سے جدا نہیں ہے۔ تاہم ان کے اسلوب میں چند ایسی باتیں ہیں جو ان کو ان کے دیگر معاصرین سے جدا کر دیتی ہیں۔ الفاظ کو برتنے میں گرچہ کوئی نیا پن نہیں ہونے کے باوجود ایک ہی طرح کے لفظ کو مختلف جگہوں پر مختلف معنی دینے کی کوشش قابل تحسین ہے۔

ان کے یہاں ایسے الفاظ بہ کثرت ملتے ہیں جن سے کوئی بھی قاری غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر کو بوقت شعر گوئی اس بات کا مطلق احساس نہیں رہتا ہے اس کا قاری کیا سوچ رہا ہے۔ شاعر کو ان الفاظ سے حد درجہ انسیت کے اسباب و علل پر غور کرنا قارئین کا درد سری ہے۔ مگر یہ بات بھی حق بجانب ہے کہ شاعر ہمہ وقت اس خیال کا اسیر ہے کہ اس کے اندر امکانات کا ایک بے پایاں سمندر موجزن ہے۔ جو کسی آسمانی اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے اشعار میں جا بجا آسمان، سمندر اور قطرہ وغیرہ الفاظ کا بہ کثرت استعمال اس بات کا غماز ہے۔ آسمان۔ سمندر اور قطرہ کے علامات سے اس کے خیالات کی گہرائی۔ گیرائی اور ادراک کی ہمہ گیری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی،

شاعری کا جزو لازم ہے۔ شاعر کے تخلیقی عمل کے پس پردہ اس کی خود اعتمادی کے دخل سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے تخلیقی عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نقاد کو سمجھتا ہے۔ اس کو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں رہتی کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے۔ کوئی اچھا کہے یا برا وہ صرف صحت مند تخلیق کا قائل ہے۔

آسمانی یار نکلا میرا تخلیقی سفر
دو قدم آگے نہ نکلا حوصلہ نقاد کا

علامہ اقبال نے شاہین کو بلند پروازی کی علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ان کے کلام میں جا بجا شاہین کی موجودگی جس طرح اپنے قارئین کو مسرور کرتی ہے اسی طرح علیم صبا نویدی نے بھی سمندر کو کم از کم اثر خامہ میں پندرہ بیس بار استعمال کیا ہے۔ لیکن تقریباً ہر اس مصرعہ میں جہاں سمندر کا استعمال ہوا قطرے کو بھی لایا گیا۔ قطرہ اور سمندر کو بیک وقت استعمال کرنے کا یہ رجحان فطرت کی ایک سچائی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سمندر میں قطرے کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مگر انسان اس عظیم کائنات میں قطرے کی مانند ہوتے کے باوجود اس کے اندر امکانات کا ایک جہاں روشن ہے وہ اپنے جہاں میں ایک دوسرے عظیم سمندر کی تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں۔

سمندر سمندر صدف در صدف
میں قطرہ تھا لیکن گہر دار تھا

یا

عجب بے خودی کا ہے منظر یہاں
ہے قطرے میں پنہاں سمندر یہاں

علیم صبا نویدی کی شاعری میں خصوصاً جو بات توجہ طلب ہے وہ ہے ان کے اسلوب میں فارسی آمیز الفاظ کا بہ کثرت استعمال اور ہندی سے گریز بطور خاص "اثر خامہ" کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ فارسیت کے استعمال سے کی گئی شاعری جو بقول ؎

شمس الرحمٰن فاروقی "اصلی شاعری" ہے کے قائل ہیں۔ مگر ان کے اس عمل کے در پردہ جغرافیائی اور تاریخی پس منظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ہندی سے فراریت اختیار کرنے کا ان یہ رجحان بطور خاص انہیں کا خاصہ ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ اتنے سخت گیر بھی نہیں ہیں کہ ہندی الفاظ کے استعمال کو شجرِ ممنوعہ تصور کریں۔ بہت ہی مختصر سہی مگر کہیں کہیں ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً "مدھر گیت" "پیلی رت" "منڈوے تلے" وغیرہ فارسی تراکیب کو انہوں نے جس انداز سے برتا ہے وہ قاری کے ذہن میں صوتی اور صوری دونوں اعتبار سے ایک ترنم خیز فضا کو جنم دیتے ہیں۔ قاری عالم سرور میں موجۂ فکر کی تہہ تک اترتا چلا جاتا ہے۔

ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

نگہہ شوق میں روشن ہے سفر کا منظر
جستجو نقش تجلی ٴ گہر کا منظر

شکستہ نبض چکیدہ لہو فسردہ سانس
کوئی نکالے مجھے ان قیود سے باہر

بخت روشن نقش آور نقش گر
دستِ جذبہ کا ہے منظر نقش گر

خامۂ نقش گیر میرا فن
شاہدِ باضمیر میرا فن

اب یہ کہنا ہے حسئ شوق کی زندہ دلیل
لذت احساس عمر رفتگاں اندر نہیں

ان کے فارسی آمیز اشعار میں سے صرف چند ہی کے حوالے قارئین درج بالا بطور کے حقائق سے آشنا ہو جائیں گے۔ موصوف نے فارسی آمیز لہجے میں جس خیال کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے ہندی آمیز تراکیب سے شاید ہی انہیں کامیابی ملتی۔ درج بالا اشعار

میں معنویت کا بے پایاں قلزم موخزن ہونے کے علاوہ فارسی تراکیب کے کامیاب استعمال سے لفظوں کی بے ساختہ نسست و برخاست کے اسلوب میں جو ترنم خیزی اور غنائیت جنم لیتی ہے وہی اس شاعر جنوب کی پہچان بن جاتی ہے۔ فارسیت آمیز تراکیب کے سہارے اشعار کہتے کہتے کہیں کہیں غالباً غیر شعوری طور پر ہی وہ کچھ ایسی تراکیب استعمال کر گئے ہیں جو جدید شعراء کے یہاں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ مثلاً "رشتۂ فکر سراغ" "نور آور شخصیت" "لذتِ لمس" "لبِ نصیب" "فنِ شعور" "لبِ نگاہ" "ساغری آنکھ" "نازِ جمود" وغیرہ وغیرہ

حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں "شعری تخلیق تمام تر ایک لسانی وجود ہے اس کے بطن میں مستور اسراری تجربے کے ادراک کے لئے اس لسانی نظام سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔ عام زبان ہو یا تخلیقی زبان دونوں کا مقصد یہی ہے کہ انسان اپنے مافی الضمیر کی ترسیل کرے"۔ (۱)

علیم صبانویدی نے اپنے مشاہدات تجربات اور احساسات کے اظہار کے لئے جس لب و لہجے کو اپنایا ہے وہ ان کا اپنا ہے۔ لہجہ چاہے کچھ بھی ہو اگر ترسیل کی راہ میں رخنہ زن ہونے لگے تو لہجہ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ اگر اظہار تخلیقیت کو اس کے لب و لہجے سے کوئی فائدہ پہنچے تو یقیناً تخلیق کار کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اگر علیم صبانویدی اپنے تخلیقی اسلوب میں فارسیت کو اہمیت دیتے ہیں اور اس میں کامیابی بھی ملتی ہے تو یہی ان کی عظمت ہے۔ اگر کوئی ہندی تراکیب کی کثرتِ استعمال کو اپنا اسلوب بنا لیتا ہے اور اس میں کامیابی ملتی ہے تو یہ بھی اس کی عظمت کی دلیل ہوگی۔ کم لفظوں کا استعمال بھی کامیاب شاعری کی دلیل ہے۔ علیم صبانویدی کے یہاں ایسی بہت سی غزلیں ہیں جن میں بہت ہی کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر شعری حسن میں کوئی کمی آنے کے بجائے شعر اپنی پیکریت اور علامتیت کے باعث کمال حسن تک پہنچتے نظر آتے ہیں۔

---

(۱) جدید شعری منظر نامے

مثلاً۔ شانوں پر زلفوں کا ناچ
ہرنی آنکھیں تن من مور

گھر کے باہر قبرستان
گھر کے اندر تنہائی

روزمرّہ کی باتوں میں بھی اگر کچھ جملے اسراریت کے پردے میں کہے جائیں۔
تو سامع کے شعور کے کسی گدانہ حصّے میں ایک گدگدی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔
اور شعر گوئی تو بہرحال پیکریت علامت پسندی اور پراسرار معنویت کی رہین منت ہے ہی۔ دو ٹوک انداز میں کہے گئے شعر سے علامتی اشعار کی اثر انگیزی بہت دیر پا ہوتی ہے۔ اس رمز سے جدید شاعر بخوبی واقف ہے۔ اس لئے اکثر شاعر کے یہاں نئی نئی علامات اور پیکر کی تلاش کا رجحان بقدر ظرف مل جائے گا۔ مگر اس تلاش کے دوران کوئی شاعر اتنا بھٹک جاتا ہے کہ اس پر لازماً ابہام گوئی کا الزام عائد ہونے لگتا ہے۔ یہی ابہام گوئی قاری اور تخلیق کار کے درمیان کے فاصلے کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔
بہرحال علیم صبا نویدی کی علامت نگاری اور پیکر تراشی کے عمل میں سمعی۔ شامی۔ بصری اور لمسی وغیرہ ہر طرح کے پیکر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۱) خوشنما⁽¹⁾ پھولوں کی خوشبو⁽²⁾ سے لپٹ کر سورج⁽³⁾ لے گیا لوٹ کے دامانِ سحر کا منظر⁽¹⁾	① بصری پیکر ② شامی ③ لمسی پیکر ① بصری پیکر
۲) پھول⁽¹⁾⁽²⁾ تھے نہ پھول سا کوئی بدن⁽³⁾ میرے کمرے میں معطّر⁽²⁾ کون تھا	شامی⁽²⁾⁽¹⁾۔ بصری⁽²⁾ اور لمسی⁽³⁾ پیکر
۳) میرے بدن کا آئینہ ٹوٹا سہی مگر اک بار اپنا چہرۂ احساس دیکھ لو	سمعی اور لمسی

تابوت کے لباس پہ چھڑکا گیا ہے عطر — سمعی ۔ بصری ۔ لمسی
خوشبو کے قتل کا جہاں ماتم شدید تھا — اور شامی پیکر

درج بالا اشعار میں علامت نگاری کے علاوہ پیکر تراشی کا عمل بھی کارفرما نظر آتا ہے ۔ سورج کا خوشبو سے لپٹنا بذات خود کسی خاص علامت کو پیش کرتا ہے۔ اور اس کے اس عمل میں شاعر نے کئی پیکروں کا سہارا لیا ہے. مثلاً پھول ۔ کمرہ یا سورج چونکہ بصارت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ سب بصری پیکر ہیں ۔ مگر سورج کے تصور سے روشنی کے علاوہ حرارت کا بھی خیال گزرتا ہے لہٰذا سورج کو لمسی پیکر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ۔

(۴) شعر ۔ تابوت کے لباس پر عطر چھڑکنا پھر خوشبو کے قتل کے ساتھ جہاں کا ماتم کرنا بھی علامتی شاعری کا بہترین نمونہ ہے ۔

علامتیّت اور پیکریت کے دربردہ شاعر کہیں کہیں ایسے اشعار کہہ جاتا ہے جو اسے زندہ و جاوید کردیں ۔ علیم صبا نویدی کے ایسے ہی اشعار ان کو سادگی بیان کے لئے شہرت بخشنے کے لئے کافی ہیں ۔

قسمتیں بے نور جیون راسیاں خاموش تھیں
اونگھتے چولہے تھے گھر کی تھالیاں خاموش تھیں

جا کہیں اور لپٹ یاد کی بیمار نظر
میں نہیں ہوں تری باہوں میں پھسلنے والا

غبار درد میں خود کی تلاش مشکل تھی
وگرنہ میں نے کہاں آپ کو نہیں ڈھونڈا

جتنی طویل عمر اندھیروں نے پائی ہے
اتنی طویل ہے مری تنہائی ناپ لو

عصر حاضر کے شعر نے ترقی پذیر تہذیب کے درپردہ تغیّر پذیر انسانی اقدار رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور انسانی خون کی ارزانی وغیرہ بے سمتی کی شکایت جا بجا کی ہے۔ علیم صبا نویدی نے اس کارنیک میں جس اسلوب کو اختیار کیا ہے وہ ان کا اپنا ہی ہے۔

مثلاً

ہمارے زخم ہیں انمول کیا خرید و گے
اگرچہ شہر میں سب کا لہو ہوا سستا

اب دھوپ اپنے شہر کی یوں پیلی ہو گئی
پی پی کے جس کو ساری فضا کڑوی ہو گئی

وہاں کے لوگوں کی خوراک ہے ہمارا گوشت
ہمارے پاؤں کے نیچے جو ایک دھرتی ہے

علامہ اقبال نے کہا تھا

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے ہیں"

علیم صبا نویدی کے یہاں بھی اسی کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ ان کو محض ایک کنویں کا مینڈک ہو کے رہنا مطلق پسند نہیں۔ ان کے اندر اقبال کے فلسفۂ حیات کی گہرائی نہیں ہونے کے باوجود اقبال کے انداز بیان کی نقالی ضرور پائی جاتی ہے۔

مثلاً (۱) تمہارے سامنے کچھ اور بھی ہیں گہوارے
نحیف سانس کے جھولے میں جھولتے کیوں ہو

(۲) کسی پہاڑ سے ٹکراؤ اور برس جاؤ
بدن میں کالی گھٹاؤں کا رس لئے کیوں ہو ؟

(۳) بسائے ہم نے ہی خوابوں کے شہر پیار کے گاؤں
زمانہ ساز تھے بے خانماں ہوئے ہم لوگ

(۴) ہماری عمر کی زرخیز سرزمیں بھی دیکھ
لہو کے پیڑ سے سرسبز پتیاں نکلیں

علیم صبا نویدی نے جس طرح کہیں کہیں اقبال کی فکری گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اس طرح یاس والم کے عالم میں غالب تک پہنچنے کی سعی کی۔ دو ایک شعر تو ایسے ہیں جن کے خیالات ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی غالب کی طرح ادا کئے گئے ہیں۔ جن کو تصرف نہیں کہہ کر سرقہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً

غالب نے کہا۔ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"
علیم صبا نویدی نے کہا۔ دشت و بیاباں یاد آئے
جب بھی میں نے دیکھا گھر

اس طرح سے کئی ایسے اشعار ہیں جو بظاہر غالب کے ہی معلوم ہوں گے مگر حقیقتاً وہ اشعار علیم صبا کے ہی ہیں۔ کم ازکم اندازِ بیاں علیم صاحب کا ہی ہے۔

مثلاً

میری میت پہ بھی دینے کو گناہوں کا ثبوت
آج ہر سمت سے بے رنگ دعا آئی ہے

گھر کے باہر قبرستان گھر کے اندر تنہائی

دراصل علیم صبا نویدی پر سرقے کا الزام لگانا غلط ہے۔ یہ محض ان کی کثرت مطالعہ کا ہی کرشمہ ہے کہ شعر کہتے وقت خود ان کو ہی اس کا خیال نہیں رہا تھا کہ ان کا خیال کسی اور کے خیال سے ٹکرا جا رہا ہے۔

علیم صبا نویدی ذاتی زندگی میں بھی خاصے مذہبی واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی عظمت کا سکّہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس لئے انہوں نے مختلف ساخت میں نعتیہ کلام کہے ہیں ان کی نعتوں کے تین تین مجموعے اس بات کی دلیل ہیں۔ موجودہ مجموعہ کلام میں شامل کسی کسی شعر میں متوصفانہ خیالات کا انعکاس صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ سات عالم کا ہے مجھ میں ظہور
تو یہ کہتا ہے کہ کوئی آسماں اندر نہیں

خود کو آئینہ بنا کر عکس اپنا دیکھ لے
صاف آئینہ ہے دل نقشِ گماں اندر نہیں

مندرجہ بالا اشعار میں تصوف اور فلسفۂ انسانیت کے ملے جلے تاثرات نوٹ کئے جا سکتے ہیں۔

شعر کے دونوں مصرعوں کو پڑھے بغیر مفہوم اخذ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دونوں مصرعوں کے ملنے سے ہی شعر کا مفہوم سامنے آتا ہے مگر کبھی کبھی کسی کسی شاعر کے یہاں ایسے بھی اشعار مل جاتے ہیں جن کے صرف مصرعہ اولیٰ سے ہی ایک خاص خیال کا اظہار ہو جاتا ہے۔ علیم صبا نویدی کے چند مصرعے درج کر رہا ہوں جن مصرعوں کو پڑھ کر قاری ایک خاص مفہوم کی نشان دہی کر سکتا ہے۔

(۱) " قید ہوں در و دیوار کے درمیان "

(۲) گلی گلی مری دیوانگی ہوئی مشہور

(۳) سلگ رہا تھا ہر اک سمت یاس کا دامن

(۴) سپنوں کی گرم چادریں اوڑھے ہوئے تھے لوگ

① در و دیوار کی علامت کے سہارے شاعر نے انسان پر عائد کردہ چند قوانین اور رواج کی پابندی کی بات کہی ہے۔ جو کہ انسانی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اس طرح سے دیگر مصرعوں میں بھی کئی خیالات ابھرتے اور ڈوبتے ہیں۔

علیم صبا نویدی کے یہاں کئی باتیں ایسی ہیں جو قابل گرفت بھی ہیں اور ان کی قدآور شخصیت کو قدرے گھٹا کر رکھ دیتی ہیں۔ اگر وہ مجموعہ کلام کو ترتیب دیتے وقت ذرا سی احتیاط برت لیتے تو شاید ان کے حق میں بہتر ہی ہوگا کہ دو ایک شعر خارج از بحر ہو گئے ہیں۔

مثلاً ① عیب و ہنر کا سرمایہ آخر دم وصال
پیراہن سفید میں روپوش ہو گیا

② جب بھی سفر کا ہاتھ مرے ہاتھ آ گیا
سب آسمانی دروازے وا ہو کے رہ گئے

③ خواب شہروں کے اٹھا کر پھینک دو
آ گئے جنگل میں بس لینے کے دن

علاوہ ازیں ان کے یہاں ایسے اشعار بہ کثرت مل جائیں گے جن میں زبان و بیان کی خامی موجود ہے۔

مثلاً (۱) اس کی نس نس میں سلگ اٹھا ہے دوزخ کا وجود
جب کبھی اس کا اڑتا ہے پرندہ اونچا

(۲) گھر میں ہوں کہ بے گھر سا ہوں
ایک بجھا سا منظر سا ہوں

(۳) مانتا ہوں میں اس کو اپنے اندر کا قطب
سر اُٹھائے سرزمینِ دل میں جو مینار تھا

(۴) لبوں پر اوڑھ لے گہری خموشیوں کا کفن
نقوش منظرِ فریاد چار رسومت کھینچ

(۵) آخری اظہار آنسو بن گیا
زخم خوردہ چاہتوں کو چھن گیا

(۶) نور آور شخصیت کے ساتھ ساتھ
شہرتوں کا ظرف بھی روشن گیا

درج بالا اشعار میں سے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں " سلگ اٹھا ہے" کی جگہ اگر سلگ اٹھے ہے کیا ہوتا تو غالباً صحیح ہوتا۔ مفہوم بھی صاف ہوجاتا۔ تیسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں " ایک بجھا سا منظر سا ہوں" کا آخری سا ردیف میں شامل ہے مگر پہلے کا ساتھ بھرتی کا معلوم ہوتا ہے اسکے استعمال سے فصاحت مجروح ہوتی ہے چوتھے شعر میں قطب بروزن فِعَل ہوتا ہے۔ پانچویں شعر میں شاعر نے لبوں کو ڈھا پینے یا اوڑھانے کی جگہ اوڑھ لیا ہے۔ یہ ترکیب بیان کی غلطی ہے۔ فصاحت کا تقاضہ ہے کہ لبوں کو ڈھانپ دیا جائے ویسے لبوں کو سی لینے کی ترکیب عام ہے۔ چھٹے شعر میں" چاہتوں کو چھن گیا" کی جگہ چاہتوں میں چھن گیا" صحیح ہوتا۔ شعر کا مفہوم بھی واضح ہوجاتا۔ ساتویں شعر کا مفہوم اخذ کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

مختصر یہ کہ جنوبی ہند کا یہ منفرد لب و لہجہ کا شاعر ہنوز تجربات و مشاہدات کی پرخار راہوں پر رواں دواں ہے۔ روایت شکنی کا مرتکب نہیں ہونے کے باوجود دیکھ اپنی پہچان بنائے رکھنے کی کاوشوں میں برسر عمل ضرور ہے۔ اپنے تجربات کی راہ میں رخنہ زن ہونے والی تمام دیواروں کو مٹا کر اپنی راہ خود بنانا چاہتا ہے۔ اگر اس کے کلام میں خامیاں نظر آبھی جائیں تو اس کے محاسن بھی بہت ہیں۔ ایک شاعر کو زندہ و جاوید کر دینے کے لئے وہی محاسن کافی ہیں جو علیم صبا نویدی کے زیر نظر مجموعہ کلام میں پائے جاتے ہیں۔

علیم صبا نویدی اور "اثرِ خامہ"

○ ڈاکٹر ظفر ہاشمی جمشید پور

ہر جگہ کی اپنی اپنی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے جس کی نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں یہاں اگر ان میں سے ایک ہی نوعیت پر غور کیا جائے تو شعر و ادب کے حوالے سے جنوبی ہندوستان کو بہت زیادہ اعتبار اور وقار حاصل ہو گیا ہے لہٰذا محمد قلی قطب شاہ سے لیکر علیم صبا نویدی تک اردو ادب کے نقشے میں یہ سرزمین باعث توجہ بن گئی ہے اسی تناظر میں صبا کی بھی اپنی حیثیت و اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد شعر و ادب کے افق پر طلوع ہونے والی کرنوں میں صبا کی کرن بہت زیادہ تابناک ملتی ہے۔

کچھ شخصیتیں آرائش شدہ عالم وجود میں آتی ہیں اور کچھ آنے کے بعد مزید زیبائش کرتی ہیں۔ لیکن صبا کی شخصیت اور ان کے فن میں ہم ان دونوں عناصر کا امتزاج بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صبا کے مزاج میں شعر و ادب کا ادراک اور ان کے شعور و لاشعور میں شعری و ادبی وجدان الہامی طور سے وارد ہوا ہے لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ کیوں، کہاں اور کیا کی تلاش و جستجو سے اپنی حیثیت یا ہیئت اور اہمیت کا انضمام کیا ہے اور اس کا استخراج بھی۔

یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ چھٹی دہائی کے بعد جو بھی کھیپ

ہمارے سامنے آئی اس میں بہت ہی اہم نام علیم صبا نویدی کا ملتا ہے۔ پھر صبا کے موضوعات کا تنوع بھی بے حد دلکش افادیت و اہمیت سے بھرپور ہے صبا نے جس صنف کو بھی ہاتھ لگایا اسے مکمل تکمیلیت (Total perfection) کا جامہ زیب تن کردیا۔ لہٰذا دوسری اصناف کے علاوہ صبا نے جب غزلوں کے گلشنِ بے خار میں قدم رکھا تو وہاں بھی کئی رنگ و خوشبو کے پھول کھلا دیئے۔

"اثرِ خامہ" صبا کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جس کی اہمیت ان کے مجموعوں میں گلِ سرسبد کی طرح ہے۔ اس میں کل ایک سو اکتالیس غزلیں شامل ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد سات سو نو ہوتی ہے ان غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ سات اشعار کی غزلیں ہیں اور کم سے کم تین اشعار کی۔ لیکن زیادہ تر پانچ اشعار کی غزلیں ہی ملتی ہیں۔ البتہ تین اشعار کی غزلوں میں عام طور پر مطلعے نہیں کہے گئے ہیں صبا کے یہاں یہ اہتمام لاشعوری طور پر ملتا ہے۔ چونکہ آمد کی کیفیت اور شدید تخلیقی بصیرت نے صبا کو جب اور جس طرح چاہا تخلیق کے سرچشموں سے وابستہ اور پیوستہ کردیا۔

عام طور پر غزلوں کی یکسانیت سے غزل کی حُرمت اور اس کی اہمیت پر حرف آتا ہے یہی وجہ ہے کہ عہدِ جدید میں نامور شعراء کے یہاں بھی یہی روش اور تکرار ملتی ہے جس کے باعث ان کی شاعری میں نہ کوئی تازہ کاری ملتی ہے نہ کوئی گُل کاری اور نہ انکے اسلوب میں کوئی تیکھا پن۔ ایسے تناظر میں جن شعراء کی شاعری ہمیں متوجہ ہونے پر مجبور کردیتی ہے ان میں علیم صبا نویدی کا نام خاصا اہم ہے۔

یہ بھی صبا کی اپنی انفرادیت ہے کہ ان کی شاعری پر کسی کی چھاپ نہیں ملتی۔ البتہ غالب کے کلام سے انھوں نے ہر سطح پر استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود صبا کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ غالب پرستی میں ڈوب کر کافر نہیں ہوئے یعنی انھوں نے غالب کے بُت بناکر پرستش نہیں کی۔ البتہ غالب کو انھوں نے اپنا نمونہ (Modle) ضرور بنایا۔ لیکن لفظیاتی۔ معنیاتی اور ساختیاتی ہر سطح پر اپنی

شناخت قائم رکھی اور اپنی ایک منفرد، کشادہ، طویل اور مضبوط راہ بنائی۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ قدیم اور جدید فکری دھاراؤں کی آمیزش سے صبا کے اسلوب میں انفرادیت اور کشش پیدا ہوتی ہے اور غالب کے موڈل نے ان کو ہر زاویئے سے نئی رفعت بخشی ہے لہٰذا آل احمد سرور سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام اہم ناقدین نے صبا کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "عمر خام" صبا کی غزلوں کی معراج ہے۔ جس میں باد صبا کے جھونکے بھی ہیں اور بادِ صرصر کے جھکڑ بھی۔ لیکن نویدی نے اپنی نئی نوید سے لو کے تھپیڑوں کو بھی خوشگوار بنا کر ہم سبھوں کو حد سے زیادہ سرشار کیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ انھیں سرشاریوں میں سے کچھ سرشاریوں کو اپنی گرفت میں لاؤں۔

لفظیات کے عمل اور ردِ عمل پر صبا کو مکمل درک حاصل ہے لہٰذا عام شعروں کی طرح انھوں نے بھی ہر قبیل کے الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت بنائے رکھی ہے اس میدان میں صبا کا فن (Art) وہاں پورے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے جہاں ایک ہی لفظ کا بار بار اور مختلف شکلوں میں استعمال ملتا ہے اس تناظر میں صبا نے بہت سے استعارے اور علائم کا اختراع کر کے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں۔

شعور، لاشعور، کون، کس، کیا، کیوں، مکان، لامکان، زمان مکانی (Gap) مکانی۔ لامکانی، زمانی۔ نور، نوری، سورج، سورجی، سفر، معبود، دریا، وجود، قطرہ، سمندر، منظر، اندر، باہر، زمین، آسمان۔ آسمانی، تنہائی، جستجو، شہر، عذاب، خواب، دھواں۔ رت۔ جسم۔ بدن، لہو، آئینہ، ورق، جلوس، افق، وصال، دھوپ، چاندنی، سوچ، روشنی، اندھیرا، سانس، شب، دن، سمت، اور رنگوں میں سبز رنگ کا خاص استعمال ملتا ہے جو نشاط و امید اور زرخیزی کی علامت ہے۔ اس طرح بعض لفظوں کو صبا نے

اسمِ صفت سے اسمِ ذات بنا دیا ہے۔ اور پھر اس کو اسمِ صفت کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے سینا سے سیناپن، سورج سے سورجی اور نور سے نورانی۔ نیز نوری وغیرہ۔ بیرون سے اندرون کی طرف مراجعت یا اندرون سے بیرون کا سفر ہر فنکار کو کرنا پڑتا ہے لیکن صبا کے یہاں یہ سفر ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ اور کسی ایک مقام پر وہ منجمد نہیں ہو پاتا۔ اس سفر کی خصوصیت یہ ہے کہ سراپا نور ہوتا ہے اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی لہٰذا صبا کے یہاں لفظ نور۔ نورانی اور نوری کا ایک طویل نظام اور اہتمام (System of pattern) ملتا ہے۔

صبا نے جن کے اختراع سے معنویت کی نئی نئی راہیں روشن کی ہیں۔ جیسے

جب بھی سفر کا ہاتھ ترے ہاتھ آگیا — سب آسمانی دروازے وا ہو کے رہ گئے

ذات میری ہے سراپا ضو فشاں — نور باہر نور اندر نقش گر

نوری دنیا، نوری چہرے — سیرت پیکر، صورت پیکر

کاغذ پر ہیں نوری کرنیں — صبا نویدی جدّت پیکر

صدف میں گوہر کا نور ہوگا — بسنت رُت کا غرور ہوگا

آنکھ نویدی نورانی — دل ہے یقیناً سجدہ گھر

نیک نامی کا تمہیں یہ پھل ملا — چاہتیں اپنی بھی نوری ہوگئیں

لاسمتیت کے نور کا چکھنا ہے ذائقہ — لے جا مجھے بھی جسم کی دیوار سے پرے

بدن میں ہوں، بدن سے دور ہوں میں — نصیب آور قضا کا نور ہوں میں

اک کائنات نور کی سانسوں میں آگئی — وسعت بدن کی عود کے سوچوں میں آگئی

میرے بستر پہ ہر اک رات جھکا دیتی ہیں پھر — بارش نور میں بھیگی ہوئی مہکی شامیں

میں ہوں تاریک دشاؤں کا سپاہی لیکن — ہے وہاں نور جہاں زاویے پھیلے میرے

صبا مجھے کسی انجانے شہر میں لے جا — لباس نور مرا، گھر کے روبرو نہ کھینچ

کاغذوں کے ہونٹ پیاسے دیکھ کر — انگلیوں سے نور ٹپکا تھا بہت

ہے سلامت نور پھر سے چہرۂ ایجاد کا — قد مرا ہے فکر آور ہو بہو شمشاد کا
سراپا نور ہوں یا آئینہ ہوں — سمجھ میں کچھ نہیں آتا میں کیا ہوں
خوشی زندگی کو نور دے گئی — نیا آہنگ، نیا دستور دے گئی

صبا کا یہ عمل بڑا منفرد، فکر انگیز اور اچھوتا ہے جس کے باعث پورا استعاراتی اور معنیاتی نظام وسیع تناظر میں سامنے آتا ہے۔ صبا کے یہاں شعور اور لاشعور بھی بنیادی الفاظ بن کر بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں جس سے تخلیقیت، حسیت اور جدیدیت کی بہت سی لہریں ابھر آتی ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

شعور کی پختگی کے اندر — قلم کا بھی لاشعور ہوگا
ورق ورق یہ اچانک بکھر گیا ہے آج — مرا شعور ہمیشہ جو میرے اندر تھا
میرے شعور کی گہری نظر جو اونچی ہے — کسی ستارے سے مضبوط ربط رکھتی ہے
تجلیاں ہیں جھک ہے، غموں کی دھار کہاں — مرے شعور کی راہوں میں اب بہار کہاں
میں اجنبی ہوں ازل سے غزل کے گھر میں مگر — یہ لاشعور مرا رشتہ دار سا کیوں ہے
میں دے رہا ہوں ادب کو شعور نو کا لہو — نئے شعور کا دریا رہے مرے اندر
شعورِ غم نے سکھائے ہیں گفتگو کے رموز — شعور فکر سے معجز بیاں ہوئے ہم لوگ

صبا نے لفظ "اندر" اور "باہر" کا استعمال بھی بڑے کینوس پر کیا ہے جس سے مختلف معنیاتی اور تخلیقاتی جہتیں، سمتیں، اور پرتیں سامنے آتی ہیں۔

ملاحظہ کیجئے یہ اشعار ؎

دھڑکنوں کے آئینوں پر عکس میرا منکشف — اپنے اندر ہی سے پوچھو، میں کہاں اندر نہیں
ہوا جب بھی اندھیرا اپنے اندر — نویدی چاہتیں نیندوں میں رو دیں
سسکتا، چیختا احساس تھا مرے اندر — کبھی تو جھانک کے وہ دیکھتا مرے اندر
کسی کا داخلہ دشوار ہے مرے اندر — کہ میری ذات ہی دیوار ہے مرے اندر
میں جب نکل گیا اپنے وجود سے باہر — سفر تھا میرا سمجھ کی حدود سے باہر

فرازِ عرش کی پلکوں پہ منجمد ہے لہو　　صبا جو ہو گئے ذوق سجود سے باہر

ظاہر پر ہے، میری حکومت　　اپنے اندر تو کر سا ہوں

مرے اندر سسکتے رہنے والو　　صدا بن کر کبھی ہونٹوں سے نکلو

میں جب بھی بڑھا اپنے اندر کی سمت　　مرے حق میں ہر شئے نئی آئی ہے

صبا کے اندر اور باہر کی مذکورہ تصویریں ہماری بھی ہیں آپ کی بھی اور ایک منفرد شاعر کی بھی۔ یہ تصویریں اس لئے اچھوتی ہیں کہ ان کی رنگ آمیزی حقیقت اور تخیّل کی آمیزش سے تیار ہوتی ہے۔

لفظ بھنور بھی ایک ایسا لفظ ہے جو اپنے اندر بے پناہ، وسعت اور گہرائی وگیرائی رکھتا ہے۔ جدید تناظر میں اس لفظ کا مفہوم اور بھی سنسنی خیز بن جاتا ہے۔ صبا نے اس لفظ کے بار بار استعمال سے ایک انسان اور اسکے عہد کے مصائب کو جھیلنا اور بھو گنے کا نیا منظر نامہ تیار کیا ہے۔ یہ منظر نامہ کیسا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

جنگل جنگل اک دریا　　بیچ بھنور میں میرا گھر

کٹھن گرج کا ہے جو پہنے ہوئے تابندہ لباس　　خامشی کے وہ بھنور میں نہیں پھنسنے والا

سفر نام ہے کسی بھی دوری اور بعد کو طے کرنے کا جس کا تعلق زمانہ قدیم سے ملتا ہے۔ یعنی جو انسان اور فنکار متحرک نیز فعال ہوتا ہے کامیابی ہر سطح پر اسکے قدم چومتی ہے ظاہر ہے سفر کی اپنی صعوبتیں بھی ہوتی ہیں۔ جسکو برداشت کرنے کی شدید قوت بھی چاہیئے۔ جدید عہد میں صبا نے زندگی اور تخلیقی سفر کو جوڑ کر نیا عہد نامہ دریافت کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

میرے اندر، میرے باہر کا سفر　　فکر و فن کا جو ہری نکلا سفر

جسے نصیب تھا ادراک و آگہی کا سفر　　ورق ورق وہ کہیں باب باب پھیلا تھا

شکستہ گھر سے سفر پر جو ڈالیاں نکلیں　　وہ ساتھ لے کے کھنڈر کی نشانیاں نکلیں

صعوبتوں کا سفر اس نے طے کیا ہے مگر
نہ ہاتھ میلا ہے اس کا نہ پاؤں میلا ہے

زندگی پھینک کے پُر نور سیاہی کی طرف
ہر بدن تھا سفرِ لا متناہی کی طرف

وہاں کے سفر کی نہیں کوئی حد۔
روایت کا قیدی ہے لشکر یہاں

صبا نے لفظ منظر سے بھی نیا منظر نامہ تیار کیا ہے یہ سین (Scene) بڑا انوکھا اور منفرد ہے۔ منظر سے مختلف منظر کی عکاسی پیش کرنا صبا کو اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل ہوا ہے اس کے علاوہ انکو یہ وصف اپنی تخلیقی بصیرت (Greatin vision) کی وجہ سے بھی عطا ہوا ہے چند اشعار دیکھئے ـ

آنکھ میں نقش ہائے منظر سبز
در و دیوار میں چھپا کیا ہے

میں اندھیرا تھا تو پس منظر میں چھپ
ضو فشاں اندر یہ منظر کون تھا

نگہہ شوق میں روشن ہے سفر کا منظر
جستجو نقش تجلّی گہر کا منظر

سبز رُتوں کا پاگل موسم
پت جھڑ کے منظر میں نکلا

میں جھکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر
میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اتار

نئے عہد میں جینا، اسکی شکست و ریخت سے گزرنا، تنہائی، مایوسی، خوف اور غم یہ غم کھانا ہر انسان کا مقدر بھی ہے اور ہر فنکار کے لئے ایک چیلنج بھی۔ لہٰذا صبا نے بھی قسطوں میں مر مر کر اس سے نشاط و امید کی فصلیں کشید کی ہیں مثلاً

میں کہاں دفن کروں اپنے اکیلے پن کو
ہر طرف شور ہے، مجمع ہے نئے لوگوں کا

جتنی طویل عمر اندھیروں نے پائی ہے
اتنی طویل ہے میری تنہائی ناپ لو

اکیلے پن میں جلتے کو ہسارو
مجھے چھو لو گھٹا گھنگھور رہوں میں

بجھتی تنہائی کے پیکر کے سجانے کیلئے
چاند تاروں سے کبھی نور کا زیور نہ اتار

میں جل گیا تو ساتھ مرے گھر بھی جل گیا
کمرے کا جیتا جاگتا منظر بھی جل گیا

تقدیر کے سفر کا صبا امتحان نہ پوچھ
خواہش کا رنگ، شوق کا بستر بھی جل گیا

ہمارے شہر کے سورج سے کون ڈرتا ہے
غموں کی دھوپ کوئی کر جواں ہوا تھائیں

حصارِ درد سے نکلا تو یوں ہوا تقسیم　　کہیں زمین، کہیں آسماں ہوا تھا میں

آپ نے دیکھا کہ صبا نے کس طرح تنہائی اور اکیلے پن کا دکھ اور شکوہ جھیلا ہے۔ جس میں ہم اور آپ سبھی شامل ہیں۔ تنہائی کی ردیف میں صبا کی ایک پوری غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

منظر منظر تنہائی　　چپ کا جوہر تنہائی

تخلیقیت اور معنویت کی کئی سطحیں، پرتیں اور تہیں ہوتی ہیں جن کی گرفت ہر فنکار کو نصیب نہیں ہوتی لیکن صبا نے ان سطحوں کو بھی کئی زاویوں سے منور کیا ہے مثلاً لفظیاتی اور ترکیباتی سطحوں پر انھوں نے تخلیقیت کے نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ جیسے ؎

جن رُتوں پر قتل کا الزام تھا　　وہ رتیں بھی اب سروری ہو گئیں

سورج کا شہر، شب کے اندھیرے میں پھنس گیا　　تنہائیوں کا جسم بھی دلدل میں دھنس گیا

ہر نئے دن دھوپ کی کرنوں سے مل کر کیوں صبا　　ساغری آنکھوں سے شب کی مستیاں سب اُڑ گئیں

قسمتیں بے نور، جیون راسیاں خاموش تھیں　　اونگھتے چولھے تھے گھر کے تھالیاں خاموش تھیں

رکھ گیا کاغذی خانوں میں خزانے کتنے　　یاد رکھیں گے اسے لوگ نہ جانے کتنے

ظاہر داری کیسے پہنوں؟　　جب میں اپنے اندر سا ہوں

پہلے شعر میں سروری ہو گئیں، دوسرے شعر میں۔ سورج کا شہر، تنہائیوں کا جسم تیسرے شعر میں "ساغری آنکھیں، چوتھے شعر میں قسمتیں بے نور" جیون راسیاں "اونگھتے چولھے" تھالیاں خاموش" پانچویں شعر میں "کاغذی خانوں" چھٹے شعر میں "ظاہر داری کیسے پہنوں" اور "اپنے اندر سا ہوں" کی ترکیبوں کو آپ نے ملاحظہ کیا صبا کی یہ تخلیقی بصیرت بہت سے نئے آئینہ خانوں، نگار خانوں اور پری خانوں کی آرائش و زیبائش پیش کرتی ہے جن کی آمیزش سے علیم صبا ایک شیش محل بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس میں یہ منظر بھی دلکش اور حسین معلوم ہوتا ہے۔

صبا نے لفظیات کا ایک وسیع تناظر (Large canves) اور نیا منظر نامہ دریافت کیا ہے جیسا کہ آپ نے مذکورہ سطور میں ملاحظہ کیا۔ صبا کی کچھ اور انوکھی، نادر اور فکر انگیز، ترکیبات، تشبیہات، استعارات اور علامات ملاحظہ کریں جن سے صبا نے مختلف ساختاتی اور معنیاتی آفاق کو تابناک کیا ہے۔

لبِ نصیب کی باہوں سے جب سُرور اڑا نہ جانے کتنی ہی ریکھاؤں کا غرور اڑا

اس شعر میں " لب نصیب " سُرور اڑا اور غرور اڑا " کی ترکیبوں نے جدید صنعت اور عصری آگہی " کے جمالیاتی اور استعاراتی نظام کو نئے ابعاد سے روشن کیا ہے پھر لفظ ریکھاؤں کے استعمال نے پورے شعر کی کیفیت، تخلیقیت اور بصیرت کی بہت سی نئی لہروں کو گرفت میں لے لیا ہے

کل تلک سپنوں کی شاخیں تھیں خزاں دیدہ کہ آج
تیرے آتے ہی ہر اک ٹہنی کا سپنا پن گیا

سپنوں کی شاخیں اور سپنا پن " بالکل نئی، اچھوتی اور نادر ترکیبیں ہیں۔ جن کے استعمال سے خواب حقیقت میں بدل گیا ہے اور ناممکن، ممکن بن گیا۔ خواب و حقیقت کا یہ تعلق اور رشتہ دراصل زندگی کی طویل، سفاک اور سنگلاخ راہوں کے منظر اور پس منظر سے ابھرتا ہے۔

سرسبز امیدوں کا اجڑتا ہے جو سیندور
سپنوں کی قطار آپ ہی جاتی ہے ٹھہر کیوں

مندرجہ بالا شعر کا پہلا مصرع پورے طور پر لمبی ترکیبوں سے تشکیل پایا ہے یعنی سرسبز امیدوں کا سیندور اجڑ جانا " طویل ترکیبوں کا فنکارانہ استعمال بھی صبا کا اپنا خاص وصف ٹھہرتا ہے جس کے معنیاتی ابعاد بھی اسی طرح طویل ہیں۔ دوسرے مصرعے میں بھی، سپنوں کی قطار " سے جو ردِ عمل پیدا ہوا ہے وہ فطری اور جدید دور کی شکست و ریخت کی داستان سُناتا ہے۔

جلوسِ نورِ سماوات، لے کے آنکھوں میں   میں ہر بجھے ہوئے منظر سے جاگ اٹھوں گا

"جلوس نورِ سماوات" ملاحظہ کیجئے کہ یہ ترکیب کتنی منفرد، معنی خیز اور اچھوتی ہے جس سے مختلف النوع استعاراتی، جمالیاتی، تہذیبی، فکری، لسانی اور ایمانی جلوہ پاشیاں ملتی ہیں۔

لکیریں جل گئیں، لیکن ابھی تک   ہتھیلی سے دھواں اٹھا نہیں ہے

ہتھیلی سے دھواں کا اٹھنا" اور لکیروں کا جل جانا۔" کی ترکیب کتنی شدید" قوتِ زرخیز تازہ کاری اور فنکاری کو پیش کرتی ہے صبا کی یہی "شناخت" lentity) ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

دراصل جب صبا اپنے اندرون سے بیرون کا سفر کرتے ہیں یا ان کو لاشعور سے شعور کی آگہی ہوتی ہے تو ان کے سامنے سب سے پہلے اپنی ذات آتی ہے اور فطری طور پر ان کے سامنے کون، کس، کیا، کیوں، اور کہاں کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اسے حل کرنے میں وہ مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔

جہاں وہ مکان سے لامکان اور زبان سے بے زبان ہو جاتے ہیں ان کے اندر اور باہر کا یہ سفر دریا اور سمندر کو پار کرتا ہوا، تمام بھنور سے گزرتا ہوا کہ ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا بلکہ کبھی دھوپ کبھی چاندنی۔ کئی عذاب اور اندھیروں سے گزرتا ہے تو اس کو تنہائی کا کرب ملتا ہے اس کے خواب لوٹ جاتے ہیں کبھی آئینہ اپنا عکس بدل دیتا ہے جس سے تمام جسم میں لہو مرتعش ہوا اٹھتا ہے اور اسکے ارتعاش اور خوشبو سے سانسوں کا جمال مہک اٹھتا ہے اس طرح کبھی وصال اور کبھی اس کی تمنائیں حیات و کائنات کا سورج ایک نور کی لڑی سجا کر تمام وجود میں بکھر جاتا ہے صبا کی یہی مسلسل تلاش، تڑپ اور جستجو ان کو کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتی۔

علیم صبا نویدی کی پوری شاعری اندر سے باہر تک کے حیاتیاتی اور کائناتی رشتوں کی کھوج ہے اس کھوج سے وہ تمام رشتوں اور عبد و معبود کے تعلق کا انکشاف

کرتے ہیں۔ صبا کی پہلی غزل سے ہی یہ اشعار دیکھتے ہیں۔ ؎

نہ روشنی، نہ اندھیرا، نہ دود ہونا تھا　　مجھے بھی تیری طرح لا وجود ہونا تھا

ہر ایک شئے کو یہاں لا حدود ہونا تھا　　گرفتِ شب سے نکل کر نمود ہونا تھا

گھٹن کی دھوپ، کشاکش کی آنچ میں بھی اسے　　دیارِ ضبط میں محوِ سجود ہونا تھا

لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو　　سرِ فلک بھی کوئی کھیل کود ہونا تھا

درج بالا اشعار میں کوئی مخصوص حصار بندی یا صناع کاری کی سرخیاں نہیں ملتیں اور نہ کوئی پتھر کی لکیر ملتی ہے۔ بلکہ اپنی وجودیت اور محدودیت کو لامحدود اور لاوجود ہو جانے کی روشنی ملتی ہے۔ اس رنگ و آہنگ میں کچھ اور اشعار دیکھئے۔

خبر نہ چھت کو نہ دیوار کو نہ در کو ہے　　میں اپنے گھر میں ہوں میری تلاش گھر کو ہے

رواں دواں ہیں کئی کشتیاں سرِ ساحل　　کہ انتظار میری ناؤ کا بھنور کو ہے

میرے بغیر نہ منزل، نہ منزلوں کا وجود　　صبا نویدی مری جستجو سفر کو ہے

میں کہاں اور ہوں کب پوشیدہ　　ذات ہے میری عجب پوشیدہ

علیم صبا نویدی کا یہ تمام شعری رویّہ (Treatment) لمحہ لمحہ اور قطرہ قطرہ سفر تا سفر اسی طرح پلتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی اکائی کا طویل سفر اجتماعیت ورکثرت کی شناخت بن جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہر انسان اور فنکار کی طرح صبا کی ذات بھی ایک کائی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے لیکن ان کے اندر اپنی ذات کی تقسیم و تجسیم کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس کو ایک مرکز پر ہم نہیں لا سکتے۔ اس طرح صبا ے یہاں وجود لا وجود ہو جاتا ہے اور ان کی ذات حیات و کائنات کے وسیع تناظر کا یک حصّہ بن جاتی ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

جو سماں باہر ہے میرے وہ سماں اندر نہیں　　لامکاں باہر ہوں لیکن لامکان اندر نہیں

میں یہ کہتا ہوں کہ سات عالم کا ہے مجھ میں ظہور　　تو یہ کہتا ہے کہ کوئی آسماں اندر نہیں

وہ قطرہ جو وسعت میں تھا کائنات سمندر کے سینے کی دھڑکن ہوا

آسمانی منزلیں روشن ہوئیں جب زمیں کی گود سے نکلا نصیب

جلا کے اپنے بدن کو دھواں ہوا تھا میں بکھر بکھر کے زمان و مکاں ہوا تھا میں

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ صبا کے سامنے جیسی بھی منزل ہو، خلوت ہو یا جلوت سفر ہو یا حضر، اندرون ہو یا بیرون۔ ان کے سامنے ہمیشہ کیوں۔ کیا۔ کس۔ کہاں اور کیسے کا سوال ابھرتا رہتا ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے ہیں۔

چند ریکھاؤں میں لکھا کیا ہے؟ یہ اگر سچ ہے تو پھر خدا کیا ہے

میں تو باہر ہوں ہر طرف موجود پھر یہ اندر کا سلسلہ کیا ہے

میں نہ تھا تو میرے اندر کون تھا قطرہ قطرہ اک سمندر کون تھا

پھول تھے نہ پھول سا کوئی بدن میرے کمرے میں معطر کون تھا

جسم کس کا ہے، جان کس کی ہے؟ روح بیرون اڑان کس کی ہے؟

کہیں ظاہر میں وہ نہیں موجود پھر یہ باطن میں شان کس کی ہے؟

میں بھی ششدر رہوں وہ بھی ہیں حیراں یہ مہک درمیان کس کی ہے؟

یہ کون آنے کو تھا، اہتمام کس کا تھا دلوں میں جلوہ فشاں لب پہ نام کس کا تھا

ہم کیا تھے، کون تھے ہمیں اپنی خبر نہ تھی ہم یوں طواف نورِ سماوات کر چکے

صبا کی شاعری میں مذکورہ سوالات ہی دراصل کلیدی اہمیت رکھتے ہیں جب تک سوالوں کا حل نہیں ملتا۔ صبا کے تلازمات گرہ کشائی کے عمل پیش کرتے رہتے ہیں

صبا کے پورے نظامِ شاعری میں ایک خاص جمالیاتی تراش اور خراش ملتی ہے۔ یہ جمالیاتی پیکر کہیں اکائی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور کہیں لڑیوں کی صورت میں ظہور پذیر ہو کر ایک امتزاجیت (Synestnesia) کا تجربہ پیش کرتے ہیں ان کے بے شمار ایسے اشعار کو آپ نے مذکورہ صفحات میں ملاحظہ کیا ہے۔

یہاں کچھ اور مثالیں دیکھئے۔ ے

جسم کی قید سے جب نکلے گا سانسوں کا جمال — سر اٹھائیگا مرے شعلۂ سر کا منظر

سانسوں میں آگ، لب پہ دھواں، رخ پہ دھند ہے — تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی

افق سے نکلا ہے گھوڑوں پہ چاندنی کا جلوس — لبوں سے کام لو پلکوں سے بولتے کیوں ہو

کسی پہاڑ سے ٹکراؤ اور برس جاؤ — بدن میں کالی گھٹاؤں کا رس لئے کیوں ہو

آپ نے دیکھا کہ درج بالا ہر ہر شعر میں مختلف پیکروں کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے یعنی ان اشعار میں بصری پیکر بھی ہے۔ سماعی بھی، حسی بھی، جن میں قوت لامسہ اور قوتِ ذائقہ کی شدّت تیز تر ہے۔

اب الگ الگ پیکر کی مثالیں دیکھیئے۔ پہلے سماعی پیکر ؂

نہ رونا تھا جنھیں خوشیوں میں روئیں — اتر کر خواہشیں جسموں میں روئیں

اب بصری پیکر دیکھئے ؂

مجھ سے پہلے مجھ سا شاید اور کوئی تھا وہاں — میں نہ تھا تو عکس میرا کس طرح جاگا وہاں

اور حسی پیکر ؂

جتنی ساری لذتیں ہیں سب جبیں سے چوس لو — کون کرتا ہے کس کے سامنے سجدہ وہاں

صبؔا کو فطرت کے گلہائے رنگارنگ سے بس عرفان و وجدان حاصل ہوا ہے اس لئے انھوں نے فطری مناظر کی بھی بڑی دلفریب پیکر تراشیاں کی ہیں جیسے ؂

سوچوں کی چاندرات میں لفظوں کے درمیاں — اوراق کی ہتھیلی پہ پیدا ہوا تھا میں

وہ میرے ضبط کا شعلہ ہے حوصلوں کا چراغ — کھڑا ہوا ہے جو سورج کے سامنے اب تک

آج اک شاخ نے اک شاخ کو کیا چوم لیا — چارسُو پتوں سے ہلکا سا دھواں اٹھتا ہے

ورنہ میں پھیل گیا ہوتا خلاؤں کی طرح — ہاتھ سورج کا مری سوچ کے ہاتھوں میں نہ تھا

بلبلوں کا چہچہانا ہے نہ کھیتوں کی قطار — کیا لگا کر پنکھ اپنی بستیاں سب اڑ گئیں

صبؔا نے مختلف رنگوں سے بھی بہت سی انوکھی اور فکر انگیز پیکر تراشیاں کی ہیں

نیلے ارمانوں کی دھرتی پر صبؔا — کالی خواہش کا ہے منظر نقش گر

لگی اس قدر سبز پتوں کو آگ — جلے پھول پھل داغ روشن ہوا

بہار کیا ہے کہ سورج بھی میرے در پر تھا — ترا وجود تو رنگوں کا اک سمندر تھا

منظر کی آنکھ نم تھی اور فضا تھی زرد رنگ — قتل گاہوں میں جہاں سچائیاں خاموش تھیں

چاہ کے سر سبز پتوں پر مرادوں کے حروف — ذہن لکھتا جا رہا تھا، انگلیاں خاموش تھیں

چاہتوں کے سبز پتے ٹہنیوں سے کیا گرے — موسموں کے ساتھ تیرے گھر کا اجلا پن گیا

سورج نور کے مانند ہیں رشتے میرے — سبز پتوں پہ لکھے جائیں کے قصے میرے

اپنی سانسوں کی جواں بختی لئے حالات سے — سبز لمحوں کا سپاہی بر سر پیکار تھا

لبادہ پھاڑ کے جسموں سے نکلو — کبھی تو چیختے رنگوں سے نکلو

سبز قصہ لوگ اپنی رات کا کہتے رہے — جھوٹ کے منڈوے تلے سچ کو مرا کہتے رہے

سفید رنگ امن و سلامتی کا بھی ہے، محبت کا بھی اور پاکیزگی کا بھی پھر تمام رنگوں کا استخراج بھی اسی رنگ سے ہوتا ہے اس لئے یہ رنگ تمام رنگوں کا ماخذ بھی ہے اور جبر بھی اس تناظر میں یہ شعر بھی دیکھئے۔

اُجلی راتوں کا خواب غرق ہوا — سوچا سمجھا حساب غرق ہوا

صبا کی شاعری کے پورے ڈکشن میں حجاباتی رنگ و آہنگ کو سب سے زیادہ دخل ہے یہیں سے تمام رنگ و نور کی کہکشاں پھوٹتی ہے اور صبا کے اسلوب میں تازہ کاری اور نادرہ کاری کا سمندر امنڈ پڑتا ہے اس سیاق و سباق میں ان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے۔

شیشہ نہیں تھی شیشے کے مانند تھی مگر — اک ٹھیس سے ہی سوچ مری چھلنی ہو گئی

صبا کے یہاں مذکورہ جمالیاتی احساس و ادراک کے علاوہ جنسی جذبوں کا اُبال اور اُن کے اظہار کا نیا منظر نامہ بھی ملتا ہے لیکن اس سے کوئی منفی ردِ عمل، نظریہ یا جنسی کجروی سامنے نہیں آتی۔ بلکہ ایک فرحت اور تکمیلیت (Perfection) کا منظر نامہ فراہم ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

بادل برس کے کھیت پہ خاموش ہو گیا — منظر وہ پہلی رُت کا فراموش ہو گیا

دل کا اُجلا پن اندھیرا لے گیا
جسم کی ساری فضا گمبھیر تھی

درمیانی فاصلے طے ہو گئے
چاہتوں کے پاؤں میں زنجیر تھی

کیا پتہ تھا تری جلتی ہوئی سانسوں کی قطار
مری سانسوں پہ ہی ڈالے گی بچھونا اک دن

ہمارے جسم کا سورج نہ اور کیوں دہکے
ہماری چھاؤں کو چھو کر گذر گیا ہے کوئی

نئے لہو کا سفر بھی عجب سفر تھا صبا
کہ جس سفر کا افق ہر قدم منور تھا

کسی کے لمس کی خواہش نہ فاصلوں کی کسک
یہ کیسا زہر اچھالا گیا مرے اندر

مرے لہو میں کہیں موج تھی، نہ طوفاں تھا
یہ کیسا شور اچانک اٹھا مرے اندر

احساس کی سڑک پہ کڑی دھوپ دیکھ کر
مدت کے بعد قرب کا بادل برس گیا

یوں نہ خوشبو کا لہو باسی بہاروں میں اچھال
ورنہ بڑھ جائیگا پھر کرب مری سانسوں کا

گھر کے باہر نت نئے رنگوں کی لذت کا تھا شور
گھر کے اندر آرزو کی دیویاں خاموش تھیں

جھکے جھکے گرم بستر پہ پگھلنے کو صبا
کتنی سانسوں سے نکلتی نرمیاں خاموش تھیں

دن ڈھل گیا تو رات کا رشتہ جواں ہوا
وارفتگیٔ شوق کا شعلہ جواں ہوا

لہو اچھال کے جسموں کے آس پاس بہت
کہاں کہاں میں صبا اپنی ہی رگوں میں جلا

درختوں کے سبھی پھل پک گئے تھے
کہ لذت چکھنے والے تھک گئے تھے

مذکورہ جنسی پیکر تراشیاں صبا کے پورے آدمی کی لن ترانیاں ہیں ان کا یہ سفر طویل بھی ہے اور نت نیا بھی ———— اس گردِ سفر کی لذت ایک انسان کی فطرت بھی ہے اس کی مجبوری بھی اور اپنے اپنے ماحول کی عکاس بھی۔

سوال یہ ہے کہ صبا کی شاعری میں یہ رس، یہ بل اور یہ قوتِ تخلیق و قوتِ نمو کہاں سے حاصل ہوتی ہے ان کی اصل شاعری کا محرک اور ماخذ کون ہے اور کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ البتہ یہاں ایک خاص نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

صبا نے اپنی تلاش اور جستجو سے جو بھی حاصل کیا ہے اس کے ساتھ انھوں نے

اپنی شاعری کا محور اور محرک اپنی آرزوؤں کو بھی قرار دیا ہے اور ان کی طرح تکمیل کو بھی۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

آرزوؤں نے مرے دل کا دریچہ کھولا — بند دریا تھا مری ذات کا دریا کھولا

اس شعر میں آرزوؤں، بنیادی حیثیت رکھتا ہے یہ لفظ اتنا فکر انگیز اور بلیغ ہے کہ صبا کی تمام شاعری کو اس لفظ کے وسیع تناظر میں سمیٹ لیتا ہے۔

صبا کی شاعری پر کسی کی چھاپ نہیں ملتی۔ انھوں نے خود اپنی مشعل اپنے لہو سے روشن کی ہے البتہ غالب کے اسلوب اور فکر کو انھوں نے اپنا نمونہ (Modie) ضرور بنایا ہے جیسا کہ قبل میں کہہ چکا ہوں۔ لیکن وہ غالب کے مقلد نہیں ہوئے بلکہ اپنے اسلوب اور فکر کے قائد خود ہوئے لہٰذا وہ کہتے ہیں۔

بہ فیضِ فکرِ اسد پھیلتا گیا ہے صبا — وگرنہ اس کو بھی تندرہ جمود ہونا تھا

صبا کو اس لئے اپنی برتری کا احساس بھی ہے اور اپنے کارنامے کا خیال بھی۔ جس کا اعلان، اظہار اور اقرار وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

شہرِ اظہارِ غزل میں اب علیم — مجھ سے افضل اور بہتر کون تھا

مرا فن آسمانی ہو گیا ہے — کہ اسرارِ جہانی ہو گیا ہے

ماہ و انجم کی سیر کا حاصل — آسمانی سفر مرا فن ہے

جہاں شعر میں مانند آفتاب تھا وہ — صبا رسولِ غزل تھا کہ غلام کس کا تھا

زوالِ فن کی سیہ کاریاں مٹانے کو — صبا کے لب سے تھرکتی تجلیاں نکلیں

ہے انوکھا رہ تخلیق کا رنگ — بے ادب میں ہے ادب پوشیدہ

غزلوں کے رنگ و آہنگ، روانی اور آمد میں مختلف بحور کا بھی خاص ہاتھ ہوتا ہے۔ صبا نے عام طور پر اپنی غزلوں کے لئے سبک رواں اور مترنم بحر کا انتخاب کیا ہے ان کی غزلوں میں طویل بحریں نہیں ملتیں۔ لیکن مختصر ارکان والی بحور میں بھی صبا کی غزلیں دو آتشہ معلوم ہوتی ہیں چند مثالیں دیکھئے ؎

قطرہ قطرہ تھا دریا — سر سے اونچا تھا دریا
جتنی وسعت دل میں تھی — اتنا گہرا تھا دریا

الٹے لوگ ہیں الٹا گھر — جادو، کھیل۔ تماشا گھر

اکیلے پن میں تیرا نام لکھ کر — ہماری انگلیاں راتوں میں روئیں

میرا ظاہر مجھ پر حیران — میں جب بھی اندر سے نکلا

موتی جھوٹے، دریا خشک — جھوٹ کا تھا سرمایۂ خشک

میں نے دیکھی جو کائناتِ دل — میرے اندر بھی آسمان نکلا۔

آپ نے اب تک صباؔ کے بہت سے لازوال اور بے مثال اشعار کو ملاحظہ لیا ہے ان کے کچھ اور ایسے ہی اشعار دیکھئے جن کے متعلق آپ کو خود فیصلہ کرنا ہے۔

آسمانوں کی طرف پاؤں جمانے نکلے — پھول والوں کا وطن لوگ جلانے نکلے

تار ٹوٹے تو سر ہوئے بیوہ — انگلیوں کا رباب غرق ہوا

ورق ورق مرے زخموں کا خواب پھیلا تھا — فریب خوردہ لہو کا عذاب پھیلا تھا

جب سے ہوئی ہیں میری نگاہیں دراز قد — میرا ہر خیال فلک پوش ہو گیا

تبسّموں کی نئی روشنی کا شہزادہ — غموں کی دھول کے کپڑے پہن کے آیا ہے

تابوت کے لباس پہ چھڑکا گیا ہے عطر — خوشبو کے قتل کا جہاں ماتم شدید تھا

رات کی آخری دہلیز پہ یہ راز کھلا — دھوپ میں چور ہوئے آئینہ خانے کتنے

وقت سے پہلے ہی کیوں دیوانہ پن — چاک کر کے اپنا پیراہن گیا

زباں سے طاقتِ اظہار و گفتگو مت کھینچ — گھٹا دے عمر مگر جسم سے لہو مت کھینچ

شکستہ نبض، چکیدہ لہو، فسردہ سانس — کوئی نکالے مجھے ان قیود سے باہر

چھت کے نیچے کیا ہوا کس کو خبر — چھت کے اوپر تھا دھواں فریاد کا

وہ قتل گاہِ قرب میں پہنچا تو ایک رات — اس کا سفر بہ وقت اذاں روشنی میں تھا

مجھ میں میری ہی صدا ہو جاتے پتھر دیکھ لوں — روشنی کے پاؤں سے میں کھا کے ٹھوکر دیکھ لوں

مقتول کے سفر میں قاتل بھی ہم سفر　　الزام کس پہ آئے گا وہ سر بھی دیکھنا

موجوں کا پیراہن پہنے　　گویا نیچ بھنور سے نکلا

صبا کے لہجے کی تازگی، مٹھاس، حلاوت، ان کے اسلوب کی لذت۔ جدت
دلکشی اور معنیاتی ۔گہرائی سے ان کی قدر و قیمت بے پناہ ہو گئی ہے ان کے تمام
اشعار اپنے منفرد رویے (Treatment) اور اپنی زرخیزی کے اعتبار سے
بے حد اہم ہیں۔ جن میں نئی علامتوں، تشبیہوں، ترکیبوں اور استعاروں نے صبا کی
شاعری کو مختلف النوع رُخ (Dimentions) زاویوں اور حاشیوں
سے مزین کیا ہے ان کا جمالیاتی پیکر اور رنگ و آہنگ سب سے اچھوتا اور انوکھا ہے
صبا نے یہ شعر درست کہا ہے۔ ؎

نئی غزل کے مجاہدوں میں　　صبا نویدی ضرور ہوگا

علیم صبا نویدی کی غزلیں ۔ ایک تاثر

○ جناب یوسف جمال ۔ راج گانگ پور (اڑیسہ)

اردو پر آج ہر طرف سے حملہ ہو رہا ہے ایک جانب حکومت اردو سے سوتیلے پن کا سلوک کر کے اسے قتل کرنے کی سازش میں جلاد کا رول ادا کر رہی ہے تو دوسری طرف فسطائی قوتیں اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اردو کاز کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی تمام تر سطحی حرکتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جہاں تیسری جانب ہندی والوں (ان میں وسیع النظر ہندی حضرات مستثنیٰ ہیں) کا رویہ بھی مخاصمانہ و معاندانہ ہے تو چوتھی طرف اردو سے ہی عالمی شہرت پانے والے دشمن اردو کے ہاتھوں خود کو بیچ کر اردو کا کٹر دشمن نمبر ایک بنے ہوئے اردو کے رسم الخط کو بدلنے کا مضحکہ خیز مشورہ دے رہے ہیں۔

ایسی صورت میں جب ایک دور دراز اور بنجر علاقہ تملناڈو میں اردو کے دیوانوں کے ایک قافلہ (کاوش بدری، فرحت کیفی، دانش فرازی، راز امتیاز علیم صبا نویدی وغیرہ) کو دیکھتا ہوں تو نا امیدی کے بادل میں امید کا سورج مسکراتا نظر آتا ہے جدیدیت کے چراغ کے جلو میں شعر لئے تملناڈ

میں نوجوان اور باصلاحیت شاعر علیم صبا نویدی کا چہرہ تابناک دکھائی دے رہا ہے۔
صبا نویدی جنھوں نے اردو شعر و ادب کی گلیم کو اوڑھ کر اسے ہی کل متاعِ حیات سمجھ کر اور
اس سے اظہار و ابلاغ کا کام لیکر اردو کے جدید ادب میں جو نمایاں مقام بنایا ہے یہ ان
کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ انکی سخت محنت اور ریاضت کا شاخسانہ ہے
علیم صبا نویدی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری کو دو
شکلوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے اور یہ دونوں شکلیں "پیکر تراشی" اور "علامت پسندی"
پر مبنی ہیں خیر سے یہ دونوں رجحانات مغربی ادب سے وارد ہوئے ہیں علامت پسندی سے
پہلے تاثریت (Impressionism) تحریک کا زور تھا۔ لیکن اس تاثریت کی
شکل میں فرانسیسی ادیب جین مورس نے علامت پسندی کی شکل چڑھا دی۔ علامت
پسندی کے بعد مکعبیت (Cubism) اور گردابیت (Vorticism) جیسی تحریکیں
سامنے آئیں مگر اسی گردابیت میں ۱۹۱۳ء میں ٹی۔ ای۔ ہیوم کی اتباع میں ایذرا پاؤنڈ نے
"پیکریت" (Imagism) کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ صبا نے علامت پسندی اور پیکر تراشی
جیسے رجحانات سے متاثر ہو کر دونوں کو ہی اظہار و ابلاغ کا کلیہ وسیلہ بنا کر خارجی، داخلی اور
اجتماعی قدروں کے کرب کے تہہ دار معنوں کے مفہوم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔
علیم صبا نویدی جدید شعری سمندر کے وہ ماہر شناور ہیں جو اس کی تہہ تک پہنچ کر
انمول اور ہمہ جہت عصری فکروں کے موتیوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر اپنی غوّاصی کا ثبوت
دیتے آئے ہیں ان کی شاعرانہ ذکاوتی تہتیجات نیز ان کے خوبصورت جذبات کی بازگشت
میں کس قدر معنویت اور گہرائیاں پنہاں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ـــ "وہ کبھی یاد کے شعلوں کی آبرو کی محافظت کے لئے سلگ کے بجھ جاتے ہیں اور دھواں
بن جاتے ہیں کبھی لرزتی بوند کو دیکھ کر اس راز سے بہرہ ور ہوتے ہیں کہ ہم لوگ سمندر کی طرح بیکراں
ہیں، تو کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو اٹھتے ہیں کہ آج اوراق کے چہروں کا رنگ عجیب سا کیوں ہے؟
خدا جانے یہ صفحات کتنی سوچوں کا لہو پی چکے ہوں گے۔ پھر وہ غموں کے دھوئیں سے اٹا ہوا تبسّم

کی نئی روشنی کے شہزادے دیکھ کر اور ملول ہو کر متحیّر ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسا شخص ہے۔
کہ اتنی صعوبتوں کا سفر طے کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ پاؤں تک میلے نہیں ہوئے؟ وہ کبھی
اپنے شعور کو ورق ورق پر بکھرتا دیکھ کر پریشان ہیں تو کبھی اس دعویٰ پہ اڑے ہیں کہ میری
ذات وہ ذات ہے جس سے تاریخ آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خود کو صدیوں
میں بکھرتے ہوئے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے اندر ایک عجیب سا شعور برپا رہتا ہے اور وہ اس لئے
متعجب ہیں کہ نہ انکے لہو میں کہیں امواج کی سی علامت ہے اور نہ ہی طوفان کا پیش خیمہ ہے پھر
یہ شعور چہ معنی دارد؟ کبھی دوسروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ تم میری سمجھ کے فاصلوں کو ناپنے
سے معذور نظر آؤ گے، اس لئے کہ جہاں تم میری انتہا کو قریب تر پاتے ہو۔ وہیں سے میرے آغاز
کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ملے گا۔ بہتر ہے کہ کسی پہاڑ سے ٹکرا کر برس جاؤ۔ جسموں
میں کالی گھٹاؤں کا رس چھپا کر بیٹھنے سے کیا فائدہ؟ جب تمہارے سامنے متعدد گہوارے
ہیں تو یوں نحیف سانسوں کے جھولوں میں جھولنا کہاں کی دانشمندی ہے لیکن وہ بھی عجیب شخص
ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کرب کی کھائی میں کود کر خود کو ہلاکت میں ڈال دے۔ مناسب تو یہ ہوگا
کہ اسے کسی حسین فضا میں پہنچا دو مگر اسے تو ——— عجیب تر ہی کہنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ
دن بھر کھلی فضاؤں میں گھوم کر رات کو ننگی سڑک کے اوپر اپنی قسمت بچھا کر سو جاتا ہے شاعر کو
یہ بھی شکوہ ہے کہ اپنی تنہائی اتنی طویل ہے جتنی طویل عمر اندھیروں کا مقدّر ہے اگر تمہیں شک وشبہ
بھی ہے تو تجزیہ کر لو کیونکہ اس کے درد کی دھرتی بے حد پھیلی ہوئی ہے کبھی تمہیں توفیق ہو تو اس
کی تہہ تک اتر کر دیکھو شاعر کو اس کا یقین ہے کہ کسی نہ کسی روزن سے روشنی چھن کر آئے گی
اس لئے کہ تاریکیوں میں زہر اگلنے کا کچھ صلہ تو ملنا ہی چاہیئے۔ کسی کی یاد کے جلوس میں
لاسمتیت کی طرف ماضی کے شہسواروں کو اڑتے دیکھکر منہ سے اسکی چیخ نکل جاتی ہے، وہ
دل جلا ہے سوچوں کے تبسّم کی عدالت میں آنسوؤں کی خوشبو اچھال کر مسرّتوں کو غم میں
تبدیل کر دیا جب اسکے دماغ کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں تو اداس شام کو اپنا چہرہ سنوارنے کا
موقع مل جاتا ہے کبھی وہ دوستوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ آج رات کا آنچل پکڑ کر اس وقت

تک روتے رہو جب تک کہ پتھروں کے جسم سے کسی آنچ کی زبان کا سر نہ ابھرے لیکن غل مچانے سے اجتناب ضروری ہے تمہارے شور و شرابے سے کہیں جنگل کی نیند نہ اڑ جائے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے گا اور پھر اس کے بعد لاپتہ ہو جائے گا اس لئے وہ جب تک موجود ہے اسے چھیڑنے سے گریز کرو۔ کیونکہ وہ بے حد صاف گو ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دے۔ یہ بھی عجیب بات ہی ہے کہ سیاہیوں سے اجالوں کا معاہدہ ہونے کے بعد کسی بھی افق سے سورج کے ابھرنے کی علامت نہیں پائی جا رہی ہے۔

علیم صبا نویدی کا یہ مرثیہ کس قدر جاں گسل ہے کہ میری ہتھیلی کی لکیروں کو پڑھ کر کیا ہوگا۔ کیونکہ میرا نام تباہیوں کے صفحوں پر رقم ہے۔ وہ کون ہے جو ایک طویل عمر سے ایک ٹوٹا ہوا آئینہ لیکر خوابوں کی رہگذار پر اکیلا گھوم رہا ہے۔ اس پاگل نے جب سے جنگل کی شہریت اختیار کی ہے اس دن سے سڑکوں سے سنگباری کے مناظر ختم ہو گئے ہیں اپنے اکیلے پن کو وقف کرنے کے لئے پریشان ہونا کہ ہر طرف لوگوں کا مجمع ہے۔ حوصلوں کا چراغ لیکر اسکے لئے ضبط کا شعلہ بن کر سورج کے سامنے کھڑا ہونا کوئی ان کے شعر کہنے کے باوجود بھی لوگوں سے شاعر کا نام پوچھنا، نیندوں کا دریا برد کرنا ہے اپنے وجود کا خود سے خفا لگنا اس عجیب سے شخص کا اپنی چھاؤں کو بھی پی جانا، اپنی حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد اپنے ادوار سے نبرد آزما ہونا بالآخر خموشیوں کی صلیبوں میں اس کا اونچا اٹھنا۔ قہقہوں کی فضا میں گھل کر رہ جانا، خوابوں کی کائنات کو بجھی بجھی دیکھ کر تبسموں کے چراغ کو ڈھونڈ کر لانے کی خواہش ظاہر کرنا۔ انسانی ہمدردی سے مغلوب جذبے کی علامت بن جانا۔ اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے یا اس کی ہتھیلیوں پر خلوص رکھنے کو چھوڑ کر اسکی بساط کے شیشے پر ٹھوکر مارنا یعنی خوشی کے جنازے کا نکلنا۔ اپنے غم کو غموں کے استقبال کے لئے زندہ رکھنا، لوگوں کا اس کی طرف بھیگی ہوئی نظروں سے بڑھنا، اس پر پیاس کی چادر چڑھانا اپنی تاریک تنہائی کو خورشید کے اجالوں کی سڑکوں پر گرا ہوا دیکھنا، اندھیرے کے لبوں پر مسکراہٹ کے احساس کا جاگنا اور احساس کو پاگل پن کا خطاب دینا۔ گھر کو جلتا ہوا دیکھتا لبوں سے دھوئیں کا

کی نئی روشنی کے شہزادے دیکھ کر اور ملول ہو کر متحیّر ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسا شخص ہے۔ کہ اتنی صعوبتوں کا سفر طے کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ پاؤں تک میلے نہیں ہوئے؟ وہ کبھی اپنے شعور کو ورق ورق پر بکھرتا دیکھ کر پریشان ہیں تو کبھی اس دعوی پہ اڑے ہیں کہ میری ذات وہ ذات ہے جس سے تاریخ آگے بڑھنے کی جراٴت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خود کو صدیوں میں بکھرتے ہوئے دیکھتے ہیں کبھی ان کے اندر ایک عجیب سا شعور برپا رہتا ہے اور وہ اس لئے متعجب ہیں کہ نہ انکے لہو میں کہیں امواج کی سی علامت ہے اور نہ ہی طوفان کا پیش خیمہ ہے پھر یہ شور چہ معنی دارد؟ کبھی دوسروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ تم میری سمجھ کے فاصلوں کو ناپنے سے معذور نظر آؤ گے، اس لئے کہ جہاں تم میری انتہا کو قریب تر پاتے ہو۔ وہیں سے میرے آغاز کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ملے گا۔ بہتر ہے کہ کسی پہاڑ سے ٹکرا کر برس جاؤ۔ جسموں میں کالی گھٹاؤں کا رس چھپا کر بیٹھنے سے کیا فائدہ؟ جب تمہارے سامنے متعدد گھوڑے ہیں تو یوں نحیف سانسوں کے جھولوں میں جھولنا کہاں کی دانشمندی ہے لیکن وہ بھی عجیب شخص ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کرب کی کھائی میں کود کر خود کو ہلاکت میں ڈال دے۔ مناسب تو یہ ہوگا کہ اسے کسی حسین فضا میں پہنچا دو مگر اسے تو ——— عجیب تر ہی کہنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ دن بھر کھلی فضاؤں میں گھوم کر رات کو ننگی سڑک کے اوپر اپنی قسمت بچھا کر سو جاتا ہے شاعر کو یہ بھی شکوہ ہے کہ اپنی تنہائی اتنی طویل ہے جتنی طویل عمر اندھیروں کا مقدّر ہے اگر تمہیں شک و شبہ بھی ہے تو تجزیہ کر لو کیونکہ اس کے درد کی دھرتی بے حد پھیلی ہوئی ہے کبھی تمہیں توفیق ہو تو اس کی تہہ تک اتر کر دیکھو۔ شاعر کو اس کا یقین ہے کہ کسی نہ کسی روزن سے روشنی چھن کر آئے گی اس لئے کہ تاریکیوں میں زہر اگلنے کا کچھ صلہ تو ملنا ہی چاہئیے۔ کسی کی یاد کے جلوس میں لاسمتیت کی طرف ماضی کے شہسواروں کو اڑتے دیکھکر منہ سے اسکی چیخ نکل جاتی ہے، وہ دل جلا ہے سوچوں کے تبسّم کی عدالت میں آنسوؤں کی خوشبو اچھال کر مسرّتوں کو غم میں تبدیل کر دیا جب اسکے دماغ کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں تو اداس شام کو اپنا چہرہ سنوارنے کا موقع مل جاتا ہے کبھی وہ دوستوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ آج رات کا آنچل پکڑ کر اس وقت

تک روتے رہو جب تک کہ پتھروں کے جسم سے کسی آنچ کی زبان کا سر نہ ابھرے لیکن غلی مچانے سے اجتناب ضروری ہے تمہارے شور و شرابے سے کہیں جنگل کی نیند نہ اڑ جائے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے گا اور پھر اس کے بعد لاپتہ ہو جائے گا اس لئے وہ جب تک موجود ہے اسے چھیڑنے سے گریز کرو۔ کیونکہ وہ بے حد صاف گو ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دے۔ یہ بھی عجیب بات ہی ہے کہ سیاہیوں سے اجالوں کا معاہدہ ہونے کے بعد کسی بھی افق سے سورج کے ابھرنے کی علامت نہیں پائی جا رہی ہے۔

علیم صبا نویدی کا یہ مرثیہ کس قدر جاں گسل ہے کہ میری ہتھیلی کی لکیروں کو پڑھ کر کیا ہوگا۔ کیونکہ میرا نام تباہیوں کے صفحوں پر رقم ہے۔ وہ کون ہے جو ایک طویل عمر سے ایک ٹوٹا ہوا آئینہ لیکر خوابوں کی رہگذار پر اکیلا گھوم رہا ہے۔ اس پاگل نے جب سے جنگل کی شہریت اختیار کی ہے اس دن سے سڑکوں سے سنگباری کے مناظر ختم ہو گئے ہیں اپنے اکیلے پن کو وقف کرنے کے لئے پریشان ہوتا کہ ہر طرف لوگوں کا مجمع ہے۔ حوصلوں کا چراغ لیکر اسکے لئے ضبط کا شعلہ بن کر سورج کے سامنے کھڑا ہوتا کوئی ان کہے شعر کہنے کے باوجود بھی لوگوں سے شاعر کا نام پوچھنا، نیندوں کا دریا برد کرنا ہے اپنے وجود کا خود سے خفا لگنا اس عجیب سے شخص کا اپنی چھاؤں کو بھی پی جانا، اپنی حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد اپنے ادوار سے نبرد آزما ہونا بالآخر خموشیوں کی صلیبوں میں اس کا اونچا اٹھنا۔ قہقہوں کی فضا میں گھل کر رہ جانا، خوابوں کی کائنات کو بجھی بجھی دیکھ کر تبسموں کے چراغ کو ڈھونڈ کر لانے کی خواہش ظاہر کرنا۔ انسانی ہمدردی سے مغلوب جذبے کی علامت بن جانا۔ اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے یا اس کی ہتھیلیوں پر خلوص رکھنے کو چھوڑ کر اسکی بساط کے شیشے پر ٹھوکر مارنا یعنی خوشی کے جنازے کا نکلنا۔ اپنے غم کو غموں کے استقبال کے لئے زندہ رکھنا، لوگوں کا اس کی طرف بھیگی ہوئی نظروں سے بڑھنا، اس پر یاس کی چادر چڑھانا اپنی تاریک تنہائی کو خورشید کے اجالوں کی سڑکوں پر گرا ہوا دیکھنا، اندھیرے کے لبوں پر مسکراہٹ کے احساس کا جاگنا اور احساس کو پاگل پن کا خطاب دینا۔ گھر کو جلتا ہوا دیکھتا لبوں سے دھوئیں کا

اٹھنا اور خود کے کرب کے احساس کو پرکھنا۔ شاعر کا یہ بھی کہنا کہ بارہا تپتے ہوئے جسموں کے جزیروں میں ملتے رہے لیکن تنہائی کے احساس کا کرب کب ساتھ چھوڑنے والا تھا اسے کسی اور سے امید نہیں کہ کوئی اسے صدی کے پار لے جائے گا۔ بس لے دے کے ایک اس کا فن ہی ہے جس پر بھروسہ ہے وہ خود ہی ایک دن فن کی رتھ پر بیٹھ کر صدی کے اس پار پہنچ جائے گا اور جب تمام عمر کی چاہت کا صلہ خون میں نہائی ہوئی آنسوؤں کی دو بوندوں کی صورت میں ملا تو وہ بت سا ہو کر رہ گیا۔ اور اب اسکی گفتگو کی نبض ٹٹولی جا رہی ہے کہ وہ کیوں نہیں بول رہا ہے لیکن وہ تو اندھیروں سے بات کرنے کے لئے پر تول رہا ہے کوئی تو اس سے پوچھو کہ وہ تنہا ہے۔ وہ اکیلی ذات کا مسافر ہے جو لہو کا سفر کر کے تھک چکا ہے۔ اس سے باتیں کرو اور یہ بتاؤ کہ اس کے متعلق کیا کیا باتیں سوچ چکے ہو اور کیا کیا سوچتا ہے کیونکہ وہ تبسّم قید سے آزاد ہو کر اور فضاؤں سے منتشر ہو کر بکھر جائے گا۔ اور پھر تم کھوئی آواز کی گرمی کے لئے شہروں شہروں بھٹکتے رہو گے۔

علیم صبؔا نویدی نے جدیدیت کو جس انداز و فکر سے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے وہ ان کا مخصوص حصّہ ہے انھوں نے اپنے لئے شعری مسافت کا ایک علیحٰدہ اور منفرد راستہ متعین کر لیا ہے جہاں ان کی آواز کی انفرادیت جدید قدروں سے آراستہ حسّی پیکروں کو سنوارنے میں شب و روز مصروف نظر آتی ہے۔ ان حسّی پیکروں کے خط و خال کے آئینہ میں علیم صبؔا نویدی کا چہرہ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے ان کی شاعری میں نہ شدّت پسندی کا غلبہ کار فرما ہے اور نہ ہی ابہام کا شائبہ ہے انھوں نے اپنے جذبات کی عکاسی کیلئے فکروں سے بھرپور سیدھے سادے اور ڈھلے ڈھلائے پاکیزہ جملوں کے استعمال سے شعر میں ایک نئی تازگی اور نئی توانائی کا روپ دیکر شعر و ادب میں اپنے لئے ایک مقام کو پانے کی راہ ہموار کر لی ہے۔

علیم صبؔا نویدی کی غزلیں خارجی و داخلی محرکات کے علاوہ اہم نوعیت کے اجتماعی و سماجی مسئلوں کے حل کا طاقتور وسیلہ بن کر ہمیں رہ رہ کر دعوتِ فکر دیتی ہیں

اثرِ خامہ ــــ ایک تاثر

○ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

(بدرک کالج، بدرک (اڑیسہ)

تامل ناڈو کی سرزمین سے بڑی سرعت اور تابندگی سے ابھرنے والے درخشاں ستارے اور نیا آفاقی اجالا لیکر نئی سمتوں کی جانب انفرادی والہانہ پن کے ساتھ بڑھتے ہوئے دیارِ فن کو معمور کرنے والے فنکار کا تعارف یوں کرایا جا سکتا ہے۔

صدف میں گوہر کا نور ہوگا　　　بسنت رُت کا غرور ہوگا
نئی غزل کے مجاہدوں میں　　　صبا نویدی ضرور ہوگا

[illegible] سے ۱۹۹۱ء تک علیم صبا نویدی نے "روشنی کے بھنور" "شگاف در شگاف" "اجلی مسکراہٹ" "نقش گیر" "قید شکن" "لمس اول" "طرح نو" فکر سبز، ترسیلے، بھارت جیوتی شعاع شرق، مراۃ النور، تشدید، نور السموات، [illegible] اور روشن لکیر۔ جیسی تصنیفات و تالیفات کے گوہر بیش بہا سے اردو کا دامن مالا مال کیا ہے "اثرِ خامہ" ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسمیں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

اردو کی روایتی قدروں سے انحراف کر کے نئی ڈگر پر چلنے والے اس تیز گام شاعر نے جدیدیت کے ساتھ نئے نئے تجربوں کو فکری مشاہدہ کی روشنی میں اس طرح پیش کیا ہے کہ زمانے کی تلخیاں اس کی شاعری میں سمٹ آئی ہیں۔ لیکن وہ اظہار کے تجربوں میں اُلجھنے کے باوجود خود فراموشی کے زینوں سے خود اعتمادی کی دہلیز تک ایک الہامی کیفیت لئے مراجعت کرتا ہے اور اپنی متنازعہ ادبی شخصیت کو لہجے کی تازہ کاری سے انفرادیت عطا کرتا ہے اس کے اشعار اس کی غزلوں میں دروں بینی کے رجحان کی توانائی کا پیکر نظر آتے ہیں " اثرِ خامہ " سے صبا نویدی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ قطرہ جو وسعت میں تھا کائنات — سمندر کے سینے کی دھڑکن ہوا
فلک موسم میں رہ کر مطمئن ہے — مری آنکھیں مگر قسطوں میں روئیں
مجھے آوارگی کا روگ دے کر — لکیریں عمر بھر ہاتھوں میں روئیں
گھر کے باہر قبرستان — گھر کے اندر تنہائی
صبا نویدی سے مل کر — مانگے بستر تنہائی
جنگل جنگل اک دریا — بیچ بھنور میں میرا گھر
آنکھ نویدی نورانی — دل ہے یقیناً سجدا گھر
تیری ہستی جلوت پیکر — میری دنیا خلوت پیکر
نوری دنیا، نوری چہرے — سیرت پیکر، صورت پیکر

علیم صبا نویدی کے ان اشعار سے اس کے ذہنی رویّہ اور اس کی نفسیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرشاری اور سرمستی کے بجائے ایک ایسی حزنیہ لے درد و کرب کے احساس کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور اس کے اظہار کی پاکیزگی اشعار کی دلکشی میں ایک ایسی فراوانی پیدا کر دیتی ہے جس سے جمال زندگی کی ساری مصنوعی پرتیں ہٹتی چلی جاتی ہیں اور علامتی پیکر نئے انداز سے ڈھلتے جاتے ہیں۔

کاغذ پہ ہیں نوری کرنیں — صبا نویدی جدّتِ پیکر
ٹھنڈے بستر جلتے خواب — جسم پرائے میٹھے خواب
صبا نویدی پھینک آؤ — میلی خوشبو میلے خواب

سوچوں کی چاندرات میں لفظوں کے درمیاں — اوراق کی ہتھیلی پہ پیدا ہوا تھا میں
چادر کسی نے دی نہیں خلوص کی — برسات میں دکھوں کی نہایا ہوا تھا میں
ہمارے جسم کا سورج نہ اور کیوں دیکھے — ہماری چھاؤں کو چھو کر گذر گیا ہے کوئی
کسی کے لمس کی خواہش نہ فاصلوں کی کسک — یہ کیسا زہر اچھالا گیا میرے اندر

ناموری اور شہرت کے بام عروج پہ پہنچ کر بھی علیم صبا کے قدم شرافت اور نجابت کی دہلیز پہ سنبھل کر پڑتے ہیں۔

اُفق اُفق ہے صبا نویدی — لیست ہے لیکن اپنے قد میں
اچھائی کو آگ لگی ہے — فرق نہیں ہے نیک و بد میں
بڑی ہی اجنبی ہے اجنبیت — وطن سے دور ہی مشہور ہوں میں
جہاں تھے ہم وہیں بے نام رہ گئے لیکن — ہمارا نام اکیلا ہی دُور دُور اُڑا

علیم صبا نویدی کے باہر کی دنیا اسکے اندر کی دنیا سے مختلف نہیں ہے جذبۂ اخلاص اور انسانی ہمدردی تک کا فاصلہ وہ جس سُبک رَوی اور خود سپردگی کے ساتھ طے کرتا ہے یہ اس کا ہی خاصہ ہے۔

نفرتیں سب دُھل گئیں تو دل کا میلا پن گیا — صاف آئینہ ہوا، داغوں کا گہرا پن گیا
میں ہوں منحوس ملاقات کے قابل نہ سہی — اپنی نیندوں میں ذرا خواب ہی رکھئے میرے
میرے اظہار کے قطرے کے گہر ہونے تک — میرے گھر جیسا کوئی اور پیمبر نہ اتار
میری آواز کا بس اتنا کرشمہ ہے کہ اب — میرا احساس لگے ہے یہاں سب کا احساس
قسمتیں بے نور، جیون راسیاں خاموش تھیں — اونگھتے چولھے تھے گھر کے، تھالیاں خاموش تھیں
تابوت کے لباس پہ چھڑکا گیا ہے عطر — خوشبو کے قتل کا جہاں ماتم شدید تھا

مختصر یہ کہ "اثرِ خامہ"، علیم صبا نویدی کے ذہنی سفر کا ایک چھتنار پڑاؤ ہے
جہاں دو گھڑی دم لیکر آگے چلنے کو اس کے اندر کا فنکار بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہے
اور اسکی نگاہوں کے سامنے کچھ ایسا ہی منظر ہے۔

اُفق سے نکلا ہے گھوڑوں پہ چاندنی کا جُلوس
لبوں سے کام لو، پلکوں سے بولتے کیوں ہو

اکیسویں صدی کا شاعر علیم صبؔا نویدی

○ ڈاکٹر رفعت اختر، گورنمنٹ کالج، ٹونک (راجستھان)

اردو غزل روایتی تعریف کے اعتبار سے "حکایات با یار گفتن" ہے
تو نئے منظر نامہ میں غزل انسانی اقدار کی بحالی اور "ردِ تعمیر" (Deconstruction)
اور آرائشِ ذات کا نام ہے جس کا تعلق غزل کی اُس روایت سے ہے جو اپنے لغوی
مدلولات کے اعتبار سے لفظِ "غزال" سے مشتق ہے۔
قدیم زمانہ میں شکار کے دوران جب ہرن کے سینہ میں تیر پیوست
ہوتا تھا اُس وقت نیم بسمل کیفیت میں ہرن کی اضطراری سے کیفیت میں جو آواز نکلتی
تھی غزل کہلاتی! آج کے عہد میں جب حالات کے تیر شاعر کے سینہ میں پیوست
ہوتے ہیں تو اضطراری اور اضطرابی کیفیت میں جو کلمات نوکِ زباں پر آکر "اثر خامہ"
بن جاتے ہیں غزل کہلاتے ہیں۔ علیم صبانویدی کا تعلق غزل کی اسی روایت سے ہے۔
علیم کی غزل گوئی "خطِ مستقیم" کی نہیں بلکہ "خطِ منحنی" کی شاعری ہے۔
اردو شاعری میں علیم کی شاعری "منقسم شخصیت" کی منفرد مثال ہے۔
نویدی کی غزل ذات سے کائنات کے عرفان کا نام ہے بقولِ شاعر
سیّد علیم الدین نے زندگی کے سفر میں جب چودھویں منزل میں
۱۹۵۶ء میں قدم رکھا تو اچانک اُس کی ملاقات صبانویدی سے ہوئی۔ دراصل
یہ صبانویدی اُس کے وجودِ باطنی آفاق کا ایک جانا پہچانا ہمزاد ہے" (اثر خامہ: ص۔ ۵)

۱۹۷۴ء میں علیم نے اردو شاعروں میں "طرحِ نو" کی بنیاد رکھی، ٹیپ بند نظموں کی شکل میں "لمسِ اوّل" کو محسوس کیا۔ اردو شاعری کے "مفتیان" کے فتوےٰ سے بچنے کے لئے "ردِّ کفر" کو "نقش گیر" بنایا جو بھارت جوتی بن کر "ترسیلے" اور "شعاعِ شرق" کی شکل میں "تشدید" "مراۃ النور" اور "نورالسموات" اور "ن" کی قرأت میں رُکا نہیں بلکہ اس کے رشحاتِ قلم کو "روشن لکیروں" نے وہ مقام دیا کہ پھر "اثرِ خامہ" وجود میں آیا۔ لہٰذا علیم صبا نویدی اکیسویں صدی کی شاعری کا ایک معتبر نام بن گیا۔

علیم کی غزلوں میں تعطّل اور جمود نہیں بلکہ اُن کی شاعری ایک ایسا مسلسل گرتا ہوا آبشار ہے جس میں کسی قسم کی آلودگی کا شائبہ تک نہیں۔ نویدی کو اپنی شاعری کی رنگارنگی کے اظہار میں پُر اعتماد نظر آتے ہیں۔ اور یہی خود اعتمادی مکمل فن کار کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ پھر ایک اسٹیج ایسی آتی ہے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کہنا بھی ناگوار محسوس نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی جوہر بن جاتا ہے۔

نویدی کی شاعری ایک ایسے مثلث کے اردگرد گھومتی ہے جسے وجود عدم وجود، اور تخلیقی توانائی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وجودی مفکرین کی ایک جماعت خدا کے وجود کی قائل نہیں تھی جبکہ دوسری جماعت خدا کے وجود کی منکر نہیں رہی، چنانچہ فکر کے تعلق سے علیم! سارترے، اور کامو سے قریب نظر آتے ہیں تو عقیدت کے اعتبار سے ہائیڈیگر اور یاس پرس کے نقوش اُن کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وجودیت کے تعلق سے چند اشعار دیکھئے۔

نہ روشنی نہ اندھیرا نہ دود ہوتا تھا	مجھے بھی تیری طرح لاوجود ہونا تھا
ایک عالم میں رہا میرا وجود	سات عالم میں رہا میرا سفر
میں تو باہر ہوں ہر طرف سے موجود	پھر یہ اندر کا سلسلہ کیا ہے
وجود اپنا سمٹ کر اس مکاں میں	مقامِ لامکانی ہوگیا ہے
آرزوؤں نے مرے دل کا دریچہ کھولا	بند دریا تھا مری ذات کا دریا کھولا

ہوا جب بھی اندھیرا اپنے اندر نویدی چاہتیں نیندوں میں روئیں

میں جب سے نیندوں کو دریا میں پھینک آیا ہوں

مرا وجود بھی مجھ سے خفا سا لگتا ہے

مندرجۂ بالا اشعار میں وجودی مفکرین کے دونوں نظریات (میں ہوں اس لئے میں سوچتا ہوں) (میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں) ۔ کا امتزاج بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے ۔

علیم نے نہ صرف ہئیت کے تجربے کئے ہیں بلکہ پابند شاعری میں بھی تخلیقی توانائی کے جوہر دکھائے ہیں کہ اُن کی تخلیقی بصیرت، جدید حسیت، جدید تراکیب نئے علائم، ردیف و قافیہ میں جدت الفاظ کی بندش، پیکر نگاری اور عام لفظ کے تخلیقی استعمال نے نویدی کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز بنا دیا ہے ۔ ثبوت میں کچھ تراکیب ملاحظہ ہوں ۔

دیارِ ضبط، لبِ نگاہ، نیلے ارمانوں کی دھرتی، فکر کا تابندہ گوہر، لذتِ احساس، خامۂ نقش گیر، طرزِ لاریب، ضرورتوں کا آسودہ ساون، جلوت پیکر، خلوت پیکر، سیرت پیکر، جدتِ پیکر، قلم کا لاشعور، آفتابی شہر، پیلی رُتوں کا اجلا مقدر، ذات کا دریا، تخلیق غم و کرب کے بے ساختہ بادل، انگلیوں کا رباب، بے رس تبسّموں کی گھٹا، جلوت کا شہزادہ، کاغذوں کا تخت، لہو کا عذاب، ادراک و آگہی کا سفر، قربتوں کا شعور، طوافِ روز و شب، خواہشِ لمس، آنکھوں کا کمرہ، پلکوں کی دہلیز، ہتھیلیوں کے دریچے، چاندنی کا جلوس، نحیف سانس کا جھولا، روشنی کی مرمریں پھوار، گنگناتی رُتوں کا قتل، لاسمتیت کا نور، احساس کی سڑک، زخم کی شکستہ فوج، میلی رات کی سانسوں کا کرب، لرزتی بوند کا راز، خشک چاہتیں، تابوت لباس خوشبو کا قتل، اونگھتے چولھے، دماغی اجالوں کا ارتقا، خموشیوں کا کفن، ذہنی ارتقا کا زائچہ، مجلسی چہروں کا انبساط، اخلاق کے ننگے کرشمے، نگاہوں سے سونگھتا،

سبز قصہ' جیسی صدہا تراکیب، (جس کی ہر ہر ترکیب پر افسانہ اور ناول لکھے جاسکتے ہیں) اثر خامہ میں موجود ہیں۔

نئی شاعری میں چند تصورات، مثلاً وجودیت، اضافیت، برگساں کا تصور زماں، اقبال کا انسانِ کامل، فرائڈ کا تصور خواب آدکر اور یونگ کا نظریۂ لاشعور، مارکسی جدلیت کے ساتھ ساتھ تخلیق کار، ذاتی نظریہ بھی ہوتا ہے جسے جدیدیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جدیدیت کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں بلکہ نئے موسموں کی نئی فصل ہے۔

سچی جدیدیت اپنے دور کے تمام فکری اور جمالیاتی تقاضوں کے انجذاب کے ساتھ روایت کا بالیدہ ارتقائی اور تخلیقی اظہار ہے" علیم بھی اس طرز کی جدیدیت کے پیش رو ہیں۔

یاس پرس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

میرا ہونا دوسری اشیا کے ہونے سے مختلف ہے کیوں کہ مجھ میں یہ کہنے کی تاب ہے کہ "میں ہوں" جبکہ دوسروں میں "یہ تاب نہیں"۔ نویدی کی غزلوں میں اس طرز کا احساس جابجا نظر آتا ہے۔ مثلاً

زمین پر پھیلنے سے فائدہ کیا　　خودی میں پھیل کر سانسوں سے نکلو

حوصلہ ہو تو کسی دِل تھمیا کے ساتھ چل　　وہ تجھے بھی دور تیری ذات سے لے جائیگا

ہتھیلیوں کی لکیروں کو مٹا کر　　میں اپنے آپ میں ہی کھو گیا ہوں

کسی کا داخلہ دشوار ہے میرے اندر　　کہ میری ذات ہی دیوار ہے میرے اندر

صدف میں گوہر حبب سے روشن ہوا　　ضرورت کا آسودہ ساون ہوا

"اثرِ خامہ" میں موضوعات کے آزادانہ انتخاب، نئے نئے موڈ کے اظہار کے لئے نئے نئے آہنگ کی تشکیل، عام بول چال کی زبان میں متناسب ترین الفاظ کا استعمال، عضویاتی آہنگ، دروں بینی، اور شعر کی تخلیق میں غیر یقینی

تو یہ سے گریز علیم کو انگلستان کی امیجرم تحریک سے جوڑتا ہے۔ لہذا اُن کی شاعری میں اچھوتے پیکر نظر آتے ہیں۔ مثلاً

جسم کی قید سے جب نکلے گا سانسوں کا جمال
سر اُٹھائے گا مرے شعلۂ سر کا منظر
نہ رونا تھا جنہیں خوشیوں میں روئیں
اُتر کر خواہشیں جسموں میں روئیں۔

(ڈیفوزڈ امیج کی مثال)

ہم اپنے گھر میں سب سے جُدا ہو کے رہ گئے
تاریک چاہتوں کی غذا ہو کے رہ گئے

(علامتی امیج کی مثال)

ٹھنڈے بستر، جلتے خواب
جسم پرائے میٹھے خواب

(عضویاتی پیکر کی مثال)

شبِ فراق یہ خوابوں کیوں لگے پہرے
کہ بند آنکھوں کے رستے وہ آ رہا ہے کوئی

(منتشر امیج کی مثال)

جلتی راتوں کی دھواں دھار فضا اُمیر کوئی
فاصلہ ناپتا پھرتا ہے تیرے وعدوں کا

(بصری پیکر کی مثال)

حصارِ درد سے نکلا تو یوں ہوا تقسیم
کہیں زمین، کہیں آسماں ہوا تھا میں
ہنگامۂ حیات کی گرمی سمیٹ لو
تنہائیوں کی گود بہت گیلی ہو گئی

(سمعی پیکروں کی مثالیں)

آج اک شاخ نے اک شاخ کو کیا چوم لیا
چار سو پتوں سے ہلکا سا دھواں اُٹھتا ہے

(استعاراتی امیج کی مثال)

نوٹ: یوں تو اثرِ خامہ میں پیکر نگاری کی صدہا مثالیں ہیں لیکن میں نے پیکر نگاری کی تمام اقسام کی مثالوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب حالی اور آزاد جدید شاعر کہے جاتے تھے اور ڈارون کی تھیوری کا ذکر بڑے شوق سے ہوتا تھا دو عالمی جنگوں کے درمیان جب ترقی پسند تحریک وجود میں آئی تو ادب

برائے زندگی، ادب برائے سماج، کے نعرے بلند ہوئے حلقۂ ارباب ذوق کے زیر
ثر شاعری میں ہئیت کے تجربے ہوئے۔ لیکن سن ۶۰ء کی بعد ایکیشنیشلزم،
ادا ازم، فیوچرزم، کیوبزم، ریلزم، سرریلزم، جیسے میلانات و رجحانات نے
دب کے کینواس کو وسیع کیا جو یقیناً اکیسویں صدی کا اعلانیہ ہے علیم صبا نویدی
کی شاعری بھی یقیناً اکیسویں صدی کا اشاریہ ہے جس کا اظہار علیم نے خود جابجا کیا ہے.

مثلاً

میں دے رہا ہوں ادب کو شعورِ نو کا لہو
نئے شعور کا دربار ہے میرے اندر
صدیوں کو دے کے آیا ہوں کتنے نئے خیال
میرا بھی نام صفحۂ تاریخ پر لکھو !
اوروں نے اس صدی کو منور کیا تو کیا
اگلی صدی سے میرا بھی رشتہ شدید تھا
یہ آسماں بھی زمیں پہ اُترنے والا ہے
روایتوں کے ڈگر سے مکرنے والا تھا
ذہن کی شہ رگیں تراشیں تو
خون سے چیختا دھواں نکلا

مندرجۂ بالا اشعار کی روشنی میں علیم یقیناً اکیسویں صدی کا شاعر
ہے لیکن اب انہیں نقادوں سے یہ شکوہ نہیں کرنا چاہیئے کہ
آسمانی یار نکلا میرا تخلیقی سفر
دو قدم آگے نہ نکلا توسن نقاد کا

آسمانی فضا کا شاعر

○ یم۔ اے۔ مناف برتر مدراسی

جناب علیم صبا نویدی صاحب کی نظر ظاہر بیں نہیں بلکہ باطن بین ہے وہ دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کا طرزِ بیاں گو روایت سے الگ ہے مگر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے دو چار محفلوں میں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ ہمہ اوصاف کے حامل ہیں سب لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں۔ ادبی تحقیقات میں معاونت فرماتے ہیں۔ تحریک اردو کو بڑھاوا دیتے ہیں ان کا حسنِ سیرت یہ ہے کہ جب کبھی وہ مشاعرے میں صدر ہوتے ہیں یا نظامت کے فرائض انجام دیتے ہیں تو ہر شاعر کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں اور کسی کی دل شکنی ہونے نہیں دیتے۔

جناب علیم صبا نویدی صاحب روایتی رنگ میں بھی غزلیں لکھتے ہیں ان کا رجحان روایت سے بالخصوص انحراف کی طرف ہے۔ انکی افتادِ طبع نئے پن کی متقاضی ہے اس کے علاوہ موصوف اپنا مدعا کچھ اسطرح ظاہر کرتے ہیں کہ معانی کی دوہری سطح ہوتی ہے۔ ایک فوقانی اور ایک تحتانی۔ ؎

ہر ایک شئے کو یہاں لاحدود ہونا تھا ؛؛ گرفتِ شب سے نکلکر نمود ہونا تھا۔

یہاں ظاہری معنی ہیں کہ ہر شئے لامحدود اور پردۂ تاریکی سے نکلکر ظہور میں آئے اگر بغور دیکھا جائے تو شعر سے یہ مطلب بھی اخذ ہوتا ہے کہ اگرچہ انسان ایک مشت خاک ہے مگر اسکی وسعت اتنی ہے کہ فی الحال چاند تک اسکی رسائی ہوگئی ہے اور آگے چلکر اسکی رسائی کہاں تک ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اسی مضمون کو اقبال نے خودی کا ذکر کرتے ہوئے۔ یوں ادا کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ؛؛ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کے اسلوبِ اظہار اور علیم صبا نویدی کے اسلوبِ بیان میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ علیم صبا نویدی نے اپنا مفہوم بڑے محتاط انداز

میں ادا کیا ہے تاکہ علمائے کرام کی گرفت میں نہ آئیں۔ اقبال کو چھوٹ مل سکتی ہے لیکن صبا نویدی جیسے معمولی شاعر کو چھوٹ ملنی دشوار ہے۔

ایک عالم میں رہا میرا وجود۔ سات عالم میں رہا میرا سفر

بظاہر انسان ایک عالم میں ہوتا ہے لیکن بباطن اسکے کئی عالم ہوتے ہیں اسکی مثال یہ ہے کہ ہماری نظر کہیں پڑتی ہے خیال کہیں ہوتا ہے اور دماغ میں کچھ سوچ ہوتی ہے درحقیقت انسان کئی خانوں میں بٹا ہوا ہے علیم صبا نویدی کئی جگہ اندر اور باہر کا ذکر کرتے ہیں تمثیلاً

میں تو باہر ہوں ہر طرف موجود پھر یہ اندر کا سلسلہ کیا ہے

میں نہ تھا تو میرے اندر کون تھا قطرہ قطرہ اک سمندر کون تھا

ذات میری ہے سراپا ضو فشاں نور باہر نور اندر جلوہ گر

جو سماں باہر ہے میرے وہ سماں اندر نہیں لامکاں باہر ہوں لیکن لامکاں اندر نہیں

موصوف کی مُراد باہر سے وہ سماں ہے جو دکھائی دیتا ہے اور اندر سے مُراد وہ سماں ہے جو نظروں سے اوجھل ہے اگرچہ "باہر" اور "اندر" سیدھے سادھے الفاظ ہیں لیکن موصوف نے انکو گہرائی اور گیرائی دی ہے۔ مختلف اشعار میں ان لفظوں کا استعمال کچھ اس طرح ہوا ہے کہ ان کے معانی وسیع سے وسیع تر ہو گئے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ دقیق سے دقیق مطلب بھی ان لفظوں کے سہارے ادا کر دیا گیا ہے۔

موصوف کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے اور ان کی دور رس نظر آسمان کی خبر لاتی ہے۔

ماہ و انجم کی سیر کا حاصل آسمانی سفیر میرا فن

میں فلک آشنا تھا اونچا تھا پھر بدن میں تھکان کس کی ہے

دو زخوں جنتوں کی جنگ چھڑی جسم و جاں کا عذاب غرق ہوا

آسمانی منزلیں روشن ہوئیں جب زمیں کی گود سے نکلا نصیب

موصوف نے معمولی ڈھنگ سے کسقدر پتے کی بات کہدی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

دل ہے سربستہ راز سے واقف　　آنکھ کی آشنائی چہروں تک

یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ آنکھ بیرونی سطح پر پڑتی ہے اس کے برعکس دل ایک ایسا نہاں خانہ ہے جس میں نیّت، ارمان، یاد وغیرہ مکیں ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ کیفیتیں جو نظر نہیں آتیں دل اُن سے آشنا ہے۔ موصوف کے اسلوب بیاں میں جدّت اور نُدرت کے گہر بہت زیادہ روشن ہیں۔ نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس رُوپ پہ میرے کوئی افسانہ لکھے گا　　میں ایک تھا لیکن مرے چہرے تھے زیادہ

وفورِ شوق پہ ٹھنڈک کی حکمرانی تھی　　ہمارے سر پہ مگر آفتاب پھیلا تھا

بڑی ہی اجنبی ہے اجنبیّت　　وطن سے دُور ہی مشہور ہوں میں

پریشان نبضیں ٹٹولی گئیں　　مرض میرا مجھ سے نہ پوچھا گیا

کہیں کہیں موصوف کا کلام اسقدر مبہم ہے کہ اس کا مطلب فہم و ادراک سے بعید ہو جاتا ہے۔ مُشتے نمونہ از خروارے۔

آسمانوں کی طرف پاؤں جمانے نکلے　　پھول والوں کا وطن لوگ جلانے نکلے

سرحد سے کائنات کی نکلا ہوا تھا میں　　سورج کو اپنے ہاتھ سے تھاما ہوا تھا میں

لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو　　سرِ فلک بھی کوئی کھیل کو دہونا تھا

آنکھ میں نقش ہائے منظرِ سبز　　درو دیوار میں چھپا گیا ہے

گھر کے بھاگ کا نقشِ سویدا　　سمندر کی نشانی ہو گیا ہے

کاغذ پر ہیں لوری کرنیں　　صبا لویدی جدّت پیکر

اب یہ کہنا بے حسیٔ شوق کی زندہ دلیل　　لذّتِ احساسِ عمرِ رفتگاں اندر نہیں

کہا جاتا ہے کہ غالب کے زمانے میں غالب کا اکثر کلام بے معنی سمجھا جاتا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ کلام بامعنی ثابت ہوا۔ عین ممکن ہے اسی طرح صبا لویدی کا جو مبہم کلام ہے آئندہ چلکر معنی خیز ثابت ہو۔ فیصلہ وقتِ آئندہ کے ہاتھوں ہے۔

●●

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ   لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

اور آج کے دور میں اس احساسِ زیاں کا در آنا بھی تو ناگزیر ہو جاتا ہے ؎

قتل ہو جاتا ہے پُر زور ہوا کے ہاتھوں   میرا ہر شعلۂ اظہار جہاں اُٹھتا ہے

علیم صبا نویدی کی شعری بساط مختلف فنی تجربات اور موضوعاتی متفرقات کا منظر نامہ بن چکی ہے۔ لہٰذا نہ تو غزل کا ارتکاز اور نہ غزل میں اس تخلیقی اجتہاد کی توقع کی جاسکتی ہے جس سے اس کی غزل میں خوب سے خوب تر کے نئے نویلے نقش و نگار کی کوئی واضح اور تہہ دار صورت گری پیدا ہوئی ہو اور نمایاں طور سے (Pin point) کی جاسکے۔

نئی غزل براہِ راست تازہ حسیّت اور عصری آگہی سے ودیعت تصوّر کی گئی ہے ان لوازمات کی موجودگی میں نویدی کے منفرد اسلوب و اظہار کی برقراری کے لئے اگر اسکی فکری جولانیوں نے جی بھر کے ساتھ دیا ہے تو ایسے اشعار قارئین کی توجہ کا باعث بنے ہیں اور داد و تحسین کی دولتِ بیدار سمیٹنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ؎

آج اک شاخ نے اک شاخ کو کیا چوم لیا   چار سو پتّوں سے ہلکا سا دُھواں اٹھتا ہے

کچھ ایسے بھی ارمان مرے نکلے تھے زیادہ   دُشمن مرے آگے، مرے پیچھے تھے زیادہ

قربتیں جب سے شعوری ہو گئیں   دوریاں بھی کچھ ضروری ہو گئیں

اک ملن کی پیاس کو دے کر توانائی تمام   پھول کے دامن کی ساری نکہتیں سنولا گئیں

در و دیوار بھی چپ، لوگ بھی چپ   سب کی چپ میں ہے سبب پوشیدہ

مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی
۱۵ر دسمبر ۱۹۹۲ء

"اثرِ خامہ" اور صبا نویدی

○ رام پرکاش راہی، نئی دہلی

لگ بھگ بیس سال پہلے غزلیات پر مشتمل صبا نویدی کی اوّلین پیشکش "طرحِ نو" پر "تناظر" کے لئے تبصرہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا۔

"مجموعی طور پر "طرحِ نو" کی شاعری روایت سے انحراف کی شاعری ہے جس میں اظہار کا ملبوس خود اعتمادی کے بخیوں کی بنا پر پختگی کے اکتساب پر نظر رکھتا ہے اور اندرونی گداز کو صحیح اور دیرپا سڈولتا میں بدل دینے کے درپے ہے اس سلسلے کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہوئے میں نے سات منتخب اشعار ایک جگہ اور چھ اشعار دوسری جگہ پیش کئے تھے پہلے سات شعروں سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس پیکرِ سیاہ و سفید (تصنیف) اسم با مسمّیٰ کی روح کہاں مضمر ہے اور کس زاویئے سے دیکھی اور کس کروٹ محسوس کی جاسکتی ہے دوسرے چند اشعار کے ذریعے اس بات پر زور دینا مطلوب تھا کہ صبا کی شعری جد وجہد ارتقا کے عبوری مرحلوں سے بدستور دوچار ہے۔ اس کے یہاں نئے انداز میں نئی بات کہنے کے پُر خلوص رجحانات کارفرما ہیں۔۔۔۔۔ ان اشعار میں موصوف نے کم سے کم لفظیاتی ہیر پھیر سے زیادہ سے زیادہ رمزیت پیدا کرکے نفسیاتی اور فکری سچائی کے نقوش ابھارے ہیں۔۔۔۔ اور یہ اشعار نئی غزل کے معتبر مزاج کے ساتھ ساتھ بے ساختہ رنگ و آہنگ کی شعریت اور تلخ حقائق کی زود اثر ترجمانی کا رسیلا پن بھی لئے ہوئے ہیں۔"

اور آج جب کہ ۱۹۹۱ء تک مصنف کے مختلف اصنافِ سخن کے کئی مجموعوں کے علاوہ کم از کم غزلیات کے تین[1] مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جو میری نظر سے نہیں گزرے زیرِ کتاب (اثرِ خامہ) کی روشنی میں ہی صبا کے یہاں تخلیقی ارتقا کی صورتِ حال کی آئینہ داری دشوار ہے حالانکہ صبا کے یہاں ایک اچھے فنکار کی طرح یہ سنجیدہ کوشش محسوس کی جاسکتی ہے کہ

[1] "طرحِ نو"، ۱۹۷۴ء؛ "فکر بر" ۱۹۸۰ء؛ "نقش گیر" ۱۹۶۸ء

○ ڈاکٹر سیّد سجّاد حسین
شعبۂ اردو۔ مدراس یونیورسٹی

تمل ناڈو کا ایک نعت گو شاعر

علیم صبا نویدی صوبۂ تمل ناڈو کا ایک شہرۂ آفاق شاعر، بلند پایہ محقق اور بے باک نقاد ہے۔ اس کی شاعری ملک کی سرحدوں کو پار کر کے برصغیر پاکستان میں اپنی شہرت کا سکّہ قائم کر چکی ہے۔ وہ جدید لب و لہجہ کا شاعر ہے اس کی شاعری میں عصری تقاضوں کی ترجمانی اور ذاتی تجربات و احساسات کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ وہ شعر و ادب میں اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم رکھنے اور اپنے کلام کو تابانی عطا کرنے کے لیے کسی کے نُور کا محتاج نہیں بلکہ اپنے ہی ذہن و دل کی ضو فشانی سے شعر و ادب کی کائنات خود روشن کر لیتا ہے۔ وہ شعر و ادب کے میدان میں تقلید پرستی کا قائل نہیں، خوشہ چینی اُس کے مزاج و فطرت کے منافی ہے۔ وہ انفرادیت کا حامل جدیدیت کا علم بردار، نئی جہتوں کا متلاشی اور نت نئے تجربات کو شعر و ادب میں روا رکھنے والا ایک عظیم فن کار ہے، جس کے شعری تجربات بقول رضا نقوی واہی زیادہ وزنی، وسیع اور مجتہدانہ ہوتے ہیں[عله]۔ فکر و خیال کے نئے زاویوں کا تعین ہو یا فنّی قدروں کی شناخت کا مسئلہ، وہ دیدہ دلیری سے ان دشوار گزار راہوں کو اپنی شدّتِ طلب سے نہ صرف ہموار بنا دیتا ہے بلکہ اپنے ارادوں سے حاصل ہونے والی روشنی سے تاریک منزلوں کو اُجاگر بھی کر دیتا ہے: ؎

راہ کتنی ہی کٹھن ہو مگر لے پایۂ طلب
روشنی عزم کی کر دیتی ہے منزل روشن

عله رضا نقوی واہی ص 157: شعاعِ شرق۔

صوبۂ ٹمل ناڈو میں اردو شاعری کی روایت اور تاریخ کافی پرانی ہے۔ حضرت قربیؔ ویلوری، حضرت ذوقیؔ ویلوری اور حضرت لطیفؔ آرکاٹی اس صوبہ کے متقدمین شعراء کی فہرست میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ اور اپنی ایک علاحدہ شناخت بھی رکھتے ہیں۔ ان شعراء نے اردو شاعری کی روایت کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ سرزمینِ ٹمل ناڈو میں اس کی بنیادوں کو مستحکم بھی بنایا۔ ان شعراء کا کلام بیشتر غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور تاریخ گوئی پر مشتمل ہے۔ نعتیہ کلام کے جو چیدہ چیدہ نمونے ان شعراء کے دیوان میں مل جاتے ہیں ان کو پڑھنے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ نعت گوئی کو انہوں نے فنّی اظہار کے لیے نہیں بلکہ حضورؐ کی شانِ اقدس میں عقیدت مندی کا نذرانہ پیش کرنے کو اپنی سعادت اور نجات کا ذریعہ سمجھا۔ اس سے قطع نظر والاجاہی خاندان کے حکمرانوں اور نوابانِ آرکاٹ کے عہد میں یہاں شعر و ادب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ کشتِ سخن کی آبیاری کے لیے اکثر و بیشتر شعراء نے غزل گوئی کو رواج دیا، اور بعض شعراء نے مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور تاریخ گوئی کو اپنے مذاق کا نشانہ بنایا۔ والاجاہی خاندان کے چشم و چراغ اور تاجدارِ سلطنت نواب غلام غوث خان کے عہد میں لسان الحکمت نواب نشاطؔ مدراسی، مولانا تجمل حسین خان ایمانؔ گوپاموی[1] اور بیخودؔ مدراسی کے یہاں نعتیہ شاعری کے نمونے ہمیں مل جاتے ہیں۔ جو نہایت عقیدت و عزیمت اور روایتی اندازِ سخن کی غمّازی کرتے ہیں۔ ان شعراء نے نعتیہ کلام کی صورت میں باضابطہ طور پر اپنا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کیا البتہ غزل گو شعراء کی ایک طویل فہرست مل جاتی ہے جنہوں نے نعت گوئی میں تبرّکاً و عقیدتاً طبع آزمائی کی ہے۔ ایسے ہی جلیل القدر شعراء میں امیر الشعراء نواب محمد منوّر خان گوہرؔ مدراسی، جناب سیّد شاہ محمد صبغۃ اللہ صاحب حسینی القادری نورؔ مدراسی، جناب الحاج مرزا غلام عباس علی صاحب عباسؔ مدراسی[2]، افسر الشعراء جناب ناصر الدین صاحب بیخودؔ

---

[1] "قصائدِ ایمان" ایمانؔ گوپاموی کی نعتوں، سلاموں اور منقبتوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔

[2] "فانوسِ خیال" حضرت عباسؔ مدراسی کی غزلیات اور نعتوں کا مجموعہ ہے۔

مدراسی، علامہ محوی صدیقی، جناب سید ابوالبرکات انور مدراسی، جناب پروف
خان حیدر مدراسی[1]، پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی، جناب آثم کرنولی،
القادری، منشی عبدالعزیز عادل مدراسی اور پروفیسر محبوب پاشاہ محبوب
طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جناب عادل مدراسی نے "ریاضِ عقیدت" کے نا
شعری مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعہ میں بھی نعتیہ کلام کے علاوہ مناقب الم
سلام، اخلاقی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس لیے عادل مدراسی کے مجموعہ"
کو خالص نعتیہ کلام کا مجموعہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

خالص نعتیہ کلام کو (جو روایتی طرز واسلوب سے عبارت ہے
کر شائع کرنے والے شعراء کی فہرست انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ شریف
اپنے نعتیہ کلام کو کتابچوں کی صورت میں شائع کیا۔ دانش فرازی ایک طویل
"محسنِ اعظم" لکھ کر نعت گو شعراء کے زمرے سے وابستہ ہو گئے۔ عبداللہ
نعتیہ کلام کا مجموعہ نعت گوئی کے میدان میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا
للعالمین" فرید مدراسی کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ سہیل راشد کا مجموع
نعتیہ شاعری کی منزل کے تعین میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔
نے "رسولِ عربی ﷺ" کو شائع کر کے نعت گو شاعر ہونے کا بھرپور ثبوت دیا
فدائی کا "مصداق" نعت اور جدید نظموں پر مشتمل مجموعہ زیرِ طباعت
صبا نویدی کی نگرانی میں یہ مجموعہ مراحلِ طباعت طے کر رہا ہے۔

صبا نویدی جو شعر و ادب کو جدید پیرائیہ بیان اور نت نئے
سے ہم کنار کرنے کا قائل ہے، اختر الایمان کی طرح وہ بھی شاعری میں کامیا

---

[1] "حاصلِ عمر" پروفیسر حیدر علی خان حیدر کی غزلیات اور نعتوں کا مجموعہ ہے
[2] "متاعِ محبوب" پروفیسر محبوب پاشا محبوب کا شعری مجموعہ ہے جس میں نعتیں بھی
[3] شرقی مدراسی کے نعتیہ مجموعہ کا نام حاصل نہ ہو سکا اس لیے نام کی نشان دہی سے

مذہبی تقدّس کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس ضمن میں اختر الایمان کا کہنا ہے کہ
"شاعری میرے نزدیک کیا ہے؟ اگر میں اُسے ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں
تو مذہب کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جیسے انسان ایمان داری سے
کرنا چاہے اس میں جب تک تقدّس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے
اس کام کے اچھا ہونے میں ہمیشہ شبہ کی گنجائش رہے گی" [1]

چناں چہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صبا نویدی نے اختر الایمان کے اس بیان سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کو آفاقیت کی حدوں تک پہنچانے کے لیے نعت گوئی کو اپنی فکر و آہنگ کا محور بنایا اور چند ہی برسوں کے اندر یکے بعد دیگرے کئی نعتیہ شاعری کے مجموعے شائع کر دئیے۔

"ترسیلے" نظموں اور نعتیہ ہائیکو کا مجموعہ مطبوعہ 1986ء، "شعاعِ شرق" خالص نعتیہ ہائیکو نظموں کا مجموعہ مطبوعہ 1987ء "مراۃ النور" نعتیہ کلام کا مجموعہ مطبوعہ 1988ء "نور السمٰوات" اردو زبان و ادب میں نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ مطبوعہ 1990ء "ن" نعتیہ کلام کا مجموعہ مطبوعہ 1990ء

علیم صبا نویدی کے مذکورہ بالا مجموعوں کو دیکھنے کے بعد قاری اُس کے احساسات اور جذبات کی صالحیت، خیر و حسن اور صداقت پر ایمان ہی نہیں بلکہ اُسے ایک منفرد نعت گو شاعر کی حیثیت سے تسلیم بھی کرتا ہے۔ کیوں کہ حمد و نعت جیسی قدیم اصناف کو اُس نے اظہار و شعور کے نئے انداز و سلیقے دئیے۔ اور اس میں وسعت و کشادگی پیدا کی۔ نیز اس نے حمد و نعت کی اصناف کو نئی شعری ہیئتوں کا لبادہ پہنا کر نعتیہ شاعری میں دوبارہ زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ عبد المتین نے آزاد نظم میں اور کرم حیدری نے کثیر البحر پابند نظم میں نعتیں کہی ہیں۔ نئی نسل کے شاعروں میں اس نوعیت کے تجربے تحسین فراقی، راسخ عرفانی اور رشید قیصرانی بھی کر رہے ہیں۔ انور سدید، مظفر وارثی حفیظ صدیقی، کوثر ناہید اور پروین شاکر وغیرہم نے بھی آزاد نظموں کی ہیئت میں حمدیں اور نعتیں کہی ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب پاکستان سے تعلق

---

[1] "یادیں" پیشِ لفظ از اختر الایمان۔

رکھتے ہیں۔

نعت گوئی انتہائی مشکل اور معظّم فن اور عبادت ہے۔ جتنی عظیم ومکرم وہ شخصیت ہے جس کے طفیل یہ وجود میں آئی اس کی تصدیق اور اس کا اعتراف عرفیؔ جیسے شاعر نے بھی کیا ہے جو اپنے پندار شاعری کے سامنے اور اپنے دعویٰ کی تائید میں رہ رہ کر لوح وقلم کی شہادت پیش کرتا ہے لیکن نعت کی وادی میں قدم قدم پر اپنے کو باخبر رہنے کی تاکید کرتا ہے اور نعت کے فن کو تلوار کی دھار پر چلنے سے تعبیر کرتا ہے۔ ؎

- عرفی مشتاب ایں رہِ نعت ست نہ صحرا آہستہ کہ رہ بردم تیغ ست قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدیح کے وجم را

یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کی مذہبی اور تہذیبی منزلت کا معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار کس حد تک عشق رسولؐ سے مشرف و مستفیض ہے! عشق نبیؐ کا تصوّر دراصل ہمارے ذہنوں میں میلاد ناموں اور میلاد خوانوں کا دیا ہوا تھا۔ حالیؔ اور اقبالؔ نے اس کو وہاں سے نکال کر مذہب و ملّت کے اعلیٰ اقدار و روایات کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حوصلہ دیا۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کی اتباع اور اس پر عمل کرنے کی توفیق کلیتہً اللہ کی دین ہے لیکن ان اوامر اور نواہی کو بتانا اور دل نشین کر دینا ان برگزیدہ شعراء کے حصّے میں آیا جن کے حروف شیریں کی طرف اقبالؔ نے اپنے بے مثل پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے:۔ ؎

- محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

لہٰذا نعت گوئی وہ عظیم شاعری ہے جو بقول ڈاکٹر سید حامد حسین گہری ارادت اور عقیدت کے تاثرات سے تحریک پاتی ہے۔ اس میدان میں شاعر نہ تو اپنی فکر کو بے لگام چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی موضوع سخن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اسی لیے اچھی نعتیہ شاعری غزل کی روایتی شاعری سے کہیں مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے غزل گو شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے جب کہ اچھے نعت گو شعراء کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔[1]

---

[1] "مراۃ النور" ص: 82 : ڈاکٹر سید حامد حسین۔

علیم صبا کا شمار بھی اُن معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی نعتیہ شاعری کے پے در پے مجموعے شائع کر کے ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام شعروادب کی دنیا میں تسلیم کروالیا ہے۔ اپنی سنجیدگی فکر، پاکیزگی خیال، تنوع پسند طبیعت اور تازہ کار اسلوب سے نعت جیسی انتہائی مشکل اور معظّم صنف میں بھی اس طوطیٔ سخن نے اپنی آواز کی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔

"ترسیلے" علیم صبا کے جدید انداز کی نعتوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو قدیم جاپانی صنفِ شاعری "ہائیکو" کے رنگ میں 1986ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں دو قسم کی ہائیکو نظمیں شامل ہیں۔ (1) پابند ہائیکو (2) نثری ہائیکو۔ اردو میں صنفِ ہائیکو کو پہلی بار صبا نویدی نے نعت گوئی کے مقدس اظہار سے مالامال کیا۔ "شعاعِ شرق" "ترسیلے" ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس میں تقریباً سارے کے سارے پابند ہائیکو شامل ہیں۔ صبا نویدی نے ہائیکو کے ایمائی اظہار سے فائدہ اٹھاکر سرورِ کونینؐ کی مدح سرائی میں اپنی عقیدت مندی واخلاص کا اظہار ایک نئے انداز واسلوب کے ساتھ کیا ہے۔ ہائیکو کی صورت میں پیش کردہ نعتوں میں ایک جامع اشاریت اور بلیغ رمزیت کا احساس ہوتا ہے جو ہائیکو کی محاکاتی فضا کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ "ترسیلے" اور "شعاعِ شرق" میں شامل نعتوں میں شاعر اپنی جودتِ طبع سے اظہار کے نئے پیکر تراشتا اور ان کو اپنی مجتہدانہ کوششوں سے ایک نیا رنگ وروپ عطا کرتا ہے بالفاظ دیگر علیم صبا کے یہاں حمد ونعت کے مضامین جدّت کی عبا اوڑھے ہوئے پورے تصدّق کے ساتھ جلوہ گر ہیں:۔ ؎

● ــــــ آسمانوں کے بھید کا جوہر
سات عالم کے نور کا ماخذ
رونقِ کائنات کا مصدر

● ــــــ ایک سورج وجود میں آیا
آدمیت کی روشنی لے کر
نیک لمحہ وجود میں آیا

● ــــــ ذہن ودل کے سرور کا مرکز
نقش ہائے شعور سے آگے
محورِ لاشعور کا مرکز

● ــــــ آئینہ دار جوہر ہستی
اوج تابانیٔ مہ وانجم
روز وشب کے جمال کی ہستی

- آپؐ کے ذکر میں قلم کا سر
جھک گیا بصد عقیدت سے
اور الفاظ ہو گئے ہیں گہر

- آپؐ ہی آپؐ اول و آخر
آپؐ کا فیض روزِ محشر تک
آپؐ کا نور ساتوں عالم پہ (ترسیلے)

- وہ ایک منبع علم و فن کا جلوس
ہے ارض و سما کی نگاہوں کا نور
سراپا تجلّی سراپا خلوص

- وہ خیر البشرؐ ہے وہ خیر الاممؐ
جمالِ شعورِ زمین و آسماں
وہ ہے سب دھڑکتے دلوں کا بھرم

- وہ ہے ہر گہر کی چمک کا فلک
سمندر کے جلوؤں کا رمز آشنا
اُجاگر ہے جس سے صدف کی چمک (شعاعِ شرق)

"مراۃ النور" صبا نویدی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جو 1988ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل نعتوں میں شاعر کی عقیدتِ رسولؐ نے بھرپور تخلیقی اظہار پایا ہے۔ مدحتِ پیمبرؐ اور عشقِ رسولؐ میں سرشاری کو علیم دنیا و آخرت کے لیے وسیلۂ نجات اور ذاتِ کبریائی سے قربت کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہے: ؎

- یہ مدحتِ رسولؐ یہ ذکرِ شہِ اممؐ بس اے صبا نویدی یہی زادِ راہ ہے

آزاد غزل، نثری نظم، ہائیکو، سانیٹ اور دوسرے طرح طرح کے تجربے کرنے والا یہ شاعر جب نعت گوئی کی طرف رجوع ہوتا ہے تو سراپا عجز و انکساری بن کر اپنے فن و جوہر کی جلا یا شی ہی نہیں بلکہ اپنے نصیب کو بھی روشن کر لیتا ہے۔ ؎

- کیسا اٹوٹ آپؐ سے رشتہ ہے چاہ کا روشن نصیب ہو گیا اپنی نگاہ کا
- آپؐ کا نقش قدم چوم لیا جب سے مجھ سے آگے نہ کبھی کوئی زمانہ نکلا
- میں سراپا آئینہ ہوں آئینہ میرا فن اور میرا جوہر ہیں نبیؐ

1995ء میں علیم صبا نے اردو زبان و ادب میں نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ "نور السموٰت" کے زیرِ عنوان شائع کر کے سانیٹ کی ہیئت میں نعت کے موضوع کو نئے اسالیب میں ڈھالنے کا سہرا بھی اپنے ہی سر باندھا ہے۔ اپنے عہد کے پیرایۂ اظہار کو نعتیہ

مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں جو سُرعت و رفتار صبا آنویدی نے دکھائی ہے اس کے پیشِ نظر علی جواد زیدی کہتے ہیں :۔

"علیم صبا نویدی ہمارے بے انتہا فعّال اور توانا جنوب میں نئی شناختوں کے پرچم لہرا رہے ہیں اور ہماری غیر مقیّد حدود کو اُن وسعتوں سے آشنا کر رہے ہیں جو تامل ناڈو کی پیدا کردہ ہیں۔" عله

اور ڈاکٹر حفیظ اللہ نیول پوری اُس کی خلّاقانہ صلاحیتوں اور نئی تخلیقی فعّالیت سے متاثر ہو کر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"علیم صبا نویدی کی ندرتِ تخیّل اور تخلیقی سفر میں رکاوٹ اور تھکاوٹ کا شائبہ نہیں۔ جنوب کے اس مجذوب شاعر کو میں کھلی دھوپ کا مسافر کہتا ہوں جو کسی سایۂ شجر کا مرہونِ منّت نہیں ہے، سفر اور مدام سفر کا قائل ہے۔" عله

"نور السموات" کی نعتیہ سانیٹوں میں علیم صبا نویدی نے اپنے تخلیقی جوہر اور فنکارانہ صلاحیتوں کو بڑی خوبی سے نبھایا۔ اس کی خلّاقانہ ذہنیت اور فن کارانہ تخیّل کے باوجود اس کا عقیدت مند دل سراپا نیاز بن کر خاصۂ خاصان رسل کی مدحت سرائی میں اپنی بیکراں وارفتگی کے سبب گہری محویت اختیار کر لیتا ہے۔ ان نعتیہ سانیٹوں میں اس کی تخلیقی شخصیت کا متوازن، منظم اور توانا پہلو واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ میرے اس بیان کی تصدیق کے لیے نعتیہ سانیٹ سے ماخوذ چیدہ چیدہ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

• صاحبِ کون و مکاں سیدِ لولاک ہیں وہ
ان سے ذہنوں میں تجلّی کا سماں پھیلا ہے
یہ زمیں پھیلی افق پھیلا جہاں پھیلا ہے
دونوں عالم کے لیے صاحبِ ادراک ہیں وہ

• مرے فکر و فن کا ہے روشن ضمیر
مرے حوصلوں کی ہے اونچی اڑان
ہے پاکیزہ سب سے مری آن بان
میں دربارِ احمد کا ہوں اک فقیر
فقیری پہ اپنی مجھے ناز ہے
نرالا مرا شاہی انداز ہے

عله علی جواد زیدی کے تاثرات ماخوذ از "ترسیلے"
عله ڈاکٹر حفیظ اللہ نیول پوری ص: ۱۵۹ "شعاعِ شرق"

جذبۂ عشقِ محمدؐ کا سفر ہے نوری
راہ بر محسنِ اعظم کے معطّر جلوے
مہرباں ذاتِ مقدّس کے منوّر جلوے
منزلیں جلوہ فشاں راہ گزر ہے نوری
مدحتِ شاہِ زمنؐ کا ہے نظارا ہر سُو
پھول ہی پھول ہیں جلوؤں سے لدی ہے خوشبو

شہنشاہِ دیںؐ کا یہ فیضان ہے
یہ سانسوں کی دھڑکن لہو کا سفر
یہ ہونٹوں کی جنبش بیاں کے گہر
محمدؐ کا ہر شئے پہ احسان ہے
محمدؐ نہ ہوتے تو ہوتے نہ ہم
نہ اظہار ہوتا نہ نقشِ قلم

ذرّے ذرّے کو ملا حُسنِ جمالِ دلبر
آبِ کوثر میں نہائے ہوئے آئے منظر!
زندگی کرنے لگی اُنؐ کے ہی روضہ کا طواف
باوضو ذات ہوئی نیک ہوئے ہیں اوصاف

نعت گوئی کے دوران عشقِ احمدؐ میں سرشاری کے لیے جو وارفتگی، عقل و فہم اور علم و آگہی مطلوب ہے صبا نویدی کی مذکورہ سانیٹ اس کی بولتی تصویریں ہیں جن میں اخلاص و عاجزی کی صفات انتہائی عروج پر ہیں۔ اُس نے ایک نعت گو شاعر ہونے کی حیثیت سے خاصۂ خاصانِ رسلؐ کی مدح سرائی جس خلوص و محویت اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ علیم صبا کا نعتیہ کلام ہمارے لیے عہدِ حاضر کا ایک ایسا مقدس سرچشمہ ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کے اندر رسولِ عربیؐ سے والہانہ عقیدت مندی اور وارفتگی کا جذبہ بیدار ہو سکتا ہے۔ اور اسی جذبہ سے سرشار ہو کر ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد علیم کی طرح دین و دنیا میں ایک خوش نصیب اُمتی بن سکتا ہے۔ ○

سچ مچ صبا نویدی وہ خوش بخت ہیں بہت
خوابوں میں جن کی روشنیٔ دل ہے آپؐ کی

تمل ناڈو اردو پبلیکیشنز، مدراس 600002
کے مطبوعات

"آسمانِ فن کا سفیر" مطبوعہ 1985ء
(علیم صبا نویدی کی غزلوں پر مضامین کا انتخاب)
مرتب:
ڈاکٹر نجم الہدیٰ، بہار

"نٓ" مطبوعہ 1992ء
(علیم صبا نویدی کی نعتوں کا بہترین انتخاب)
مرتب:
پروفیسر محبوب پاشا، مدراس

"نقش بند" مطبوعہ 1988ء
(علیم صبا نویدی کی شاعری پر تنقیدی مضامین
مرتب:
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، آندھرا

"لہجہ تراش" مطبوعہ 1984ء
(علیم صبا نویدی کے فن اور شخصیت کا منفرد جائزہ)
مصنف:
مولانا کاظم نائطی، مدراس

"روشن لکیر" مطبوعہ 1991ء
(علیم صبا نویدی کی ہائیکوز پر تنقیدی مضامین)
مرتب:
ڈاکٹر اختر بستوی، گورکھپور

"نقشِ قلم" مطبوعہ 1992ء
(علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری پر مضامین)
مرتب:
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، آندھرا

"خامہ در خامہ" زیر طبع 1994ء
(علیم صبا نویدی کی غزلیات کا تنقیدی جائزہ)
مرتب:
ڈاکٹر محمد علی اثر، حیدرآباد

"جنوب کا شعر و ادب" مطبوعہ 1993ء
(علیم صبا نویدی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا انتخاب)
مرتب:
ڈاکٹر محمد علی اثر، حیدرآباد

علیم صبا نویدی کی تصانیف

۱	طرحِ نو	غزلیات	1974
۲	لمسِ اول	ٹیپ بند نظمیں	1978
۳	ردِّ کفر	آزاد غزلیں	1979
۴	شگاف در شگاف	مختصر افسانے	1980
۵	فکر بہ	غزلیات	1981
۶	نقش گیر	غزلیات	1984
۷	بھارت جوتی	قومی نظمیں	1985
۸	ترسیلے	ہائیکو نظمیں	1986
۹	شعاعِ شرق	" "	1987
۱۰	مراۃ النور	نعتیہ کلام	1988
۱۱	نور السّمٰوات	نعتیہ سانیٹ	1989
۱۲	تشدید	ہائیکو نظمیں	1989
۱۳	ن	نعتیہ کلام	1990
۱۴	اثرِ خامہ	غزلیں	1991
۱۵	اُجلی مسکراہٹ	مختصر افسانے	1992
۱۶	پَیشیسُم وَیَرْ گُگل	ٹمل ہائیکو نظمیں	1992
۱۷	سمتِ ساز	مِنی آزاد نظمیں	1993
۱۸	جنوب کا شعروادب	تحقیقی مضامین	1993
۱۹	ٹمل ناڈو میں اردو		زیرِ طبع

ترتیب و تدوین

۱	قید شکن	منتخب آزاد غزلیں	1982
۲	آزاد غزل	آزاد غزل پر مضامین کا مجموعہ	1983
۳	ثبوت	ساغر جنیدی کے دوہے	1990
۴	آبِ زر	اکرام کاوش کی نظموں کا مجموعہ	1992
۵	مولانا باقر آگاہ کا غیر مطبوعہ کلام		زیرِ طبع